

الانبیاء

نام | اس سورت کا نام کسی خاص آیت سے ماخوذ نہیں ہے۔ چونکہ اس میں مسائل بہت سے انبیاء کا ذکر آیا ہے، اس لیے اس کا نام "انبیاء" رکھ دیا گیا۔ یہ بھی موضوع کے لحاظ سے سورت کا عنوان نہیں ہے بلکہ محض پہچاننے کے لیے ایک علامت ہے۔

زمانہ نزول | مضمون اور انداز بیان۔ دونوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ نزول مکہ کا دور متوسط، یعنی بیماری تقسیم کے لحاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی زندگی کا تیسرا دور ہے۔ اس کے منظر میں حالات کی وہ کیفیت نہیں پائی جاتی جو آخری دور کی سورتوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ موضوع و مضمون | اس سورہ میں وہ کشمکش زیر بحث ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور سرداران قریش کے درمیان برپا تھی۔ وہ لوگ آنحضرت کے دعوائے رسالت اور آپ کی دعوتِ نو سید و عقیدہ آخرت پر جو شکوک اور اعتراضات پیش کرتے تھے ان کا جواب دیا گیا ہے۔ ان کی طرف سے آپ کی مخالفت میں جو چالیں چلی جا رہی تھیں ان پر جو توہین کی گئی ہے اور ان حرکتوں کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ جس غفلت اور بے پروائی سے آپ کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے اُس پر تنبیہ کیا گیا ہے اور آخر میں ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے زحمت اور مصیبت سمجھ رہے ہو وہ دراصل تمہارے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔

عنوان تقریر میں خاص طور پر جو امور زیر بحث آئے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ کفار مکہ کی یہ غلط فہمی کہ بشر کبھی رسول نہیں ہوتا اور اس بنا پر ان کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کرنا۔ اس کا بڑی تفصیل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔

۲۔ ان کا آپ پر اور قرآن پر مختلف اور متضاد قسم کے اعتراضات کرنا اور کسی ایک بات پر زحمتا۔

— اس پر مختصر مگر نہایت پُر زور اور حقیقی طریقے سے گرفت کی گئی ہے۔

۳۔ اُن کا یہ نعتہ کہ زندگی بس ایک کھیل ہے جسے چند روز کھیل کر یہ نہی ختم ہو جانا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں لگتا ہے۔ کسی حساب کتاب اور جزا و نزا سے سابقہ نہیں پیش آتا ہے۔ یہ چیز چونکہ اُس نعتہ کے بے اعتنائی کی اصل جڑ تھی جس کے ساتھ مہدی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا استقبال کر رہے تھے، اس لیے بڑے ہی مؤثر انداز میں اس کا توڑ کیا گیا ہے۔

۴۔ شرک پر ان کا اصرار اور زوحید کے خلاف ان کا باطلانہ تعصب جو ان کے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اصل بنائے نزع تھا۔ اس کی اصلاح کے لیے شرک کے خلاف اور زوحید کے حق میں مختصر مگر بہت وزنی اور دلنشین دلائل دیئے گئے ہیں۔

۵۔ ان کی یہ غلط فہمی کہ نبی کو بار بار ٹھیکانے کے باوجود ان پر کوئی عذاب نہیں آتا تو مزدوری جھوٹا ہے اور عذابِ الہی کی وہ وعیدیں جو وہ خدا کی طرف سے نہیں سنا تھے محض خالی خالی دھمکیاں ہیں۔ اس کو استدلال اور نصیحت، دونوں طریقوں سے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں کے اہم واقعات سے چند نظریں پیش کی گئی ہیں جن سے یہ سمجھنا مقصود ہے کہ تمام وہ پیغمبر جو انسانی تاریخ کے دوران میں خدا کی طرف سے آئے تھے، انسان تھے اور نبوت کے امتیازی وصف کو چھوڑ کر دوسری صفات میں وہ ویسے ہی انسان ہوتے تھے جیسے دنیا کے عام انسان پیدا کرتے ہیں۔ اللہ بریت اور خدا کا ان میں شائبہ تک نہ تھا بلکہ اپنی برزوردست کے لیے وہ خود خدا کے آگے ہاتھ پھیلاتے تھے۔ اس کے ساتھ اپنی تاریخی نظیروں سے دو باتیں اہم بھی خارج کی گئی ہیں ایک یہ کہ انبیاء پر طرح طرح کے مصائب آتے ہیں، اور ان کے مخالفین نے بھی ان کو براہ کرنے کی کوششیں کی ہیں، مگر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر معمولی طریقوں پر ان کی نصرت فرمائی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام انبیاء کا دین ایک تھا اور وہ وہی دین تھا جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں۔ تاریخ انسانی کا اصل دین یہی ہے، اور باقی جتنے مذاہب دنیا میں بنے ہیں وہ محض گمراہ انسانوں کے ڈالے ہوئے نذر تھے ہیں۔

آخر میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اسی دین کی پیروی اختیار کرنے پر ہے۔ جو لوگ اسے قبول کریں گے وہی خدا کی آخری عدالت سے کامیاب نکلیں گے اور زمین کے وارث ہوں گے۔ اور جو لوگ اسے رد کر دیں گے وہ آخرت میں بدترین انجام سے دوچار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ وہ فیصلے کے وقت سے پہلے اپنے نبی کے ذریعے سے لوگوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو نبی کی آمد کو اپنے لیے رحمت کے بجائے زحمت سمجھ رہے ہیں۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

قریب آنگا ہے لوگوں کے حساب کا وقت، اور وہ ہیں کہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس جو تازہ نصیحت بھی ان کے رب کی طرف سے آتی ہے، اس کو تکیف سنتے ہیں اور کھیل میں پڑے رہتے ہیں، دل ان کے دوسری ہی فکر میں (متنہک) ہیں۔

اسے مراد ہے قریب قیامت یعنی اب وہ وقت دور نہیں ہے جب لوگوں کو اپنا حساب دینے کے لیے اپنے رب کے آگے حاضر ہونا پڑے گا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اس بات کی علامت ہے کہ نوع انسانی کی تاریخ اب اپنے آخری دور میں داخل ہو رہی ہے۔ اب وہ اپنے آغاز کی بہ نسبت اپنے انجام سے قریب تر ہے۔ آغاز اور وسط کے مرحلے گزر چکے ہیں اور آخری مرحلہ شروع ہو چکا ہے۔ یہی مضمون ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ آپ نے اپنی دو انگلیاں کھڑی کر کے فرمایا بَعثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ ۚ میں ایسے وقت پر مبعوث کیا گیا ہوں کہ میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں یعنی میرے بعد قیامت ہی ہے۔ کسی اور نبی کی دعوت بیچ میں حامل نہیں ہے۔ سنبھلنا ہے تو میری دعوت پر سنبھیل جاؤ۔ کوئی اور راہی اور شیر و نذیر آنے والا نہیں ہے۔

اسے یعنی کسی تشبیہ کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ نہ خود سوچتے ہیں کہ پہلا انجام کیا ہونا ہے اور نہ اس پیغمبر کی بات سنتے ہیں جو انہیں خبردار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اسے یعنی قرآن کی ہر نئی سورت جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتی ہے اعدائے نبی سنائی جاتی ہے۔

اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں کہ یہ شخص آخر تم جیسا ایک بشری تو ہے، پھر کیا تم آنکھوں دیکھتے جاؤ کہ چنندے میں چھینس جاؤ گے؟

نکہ وَهُمْ يَلْبِغُونَ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو اوپر ترجمہ میں اختیار کیا گیا ہے، اور اس میں کھیل سے مراد یہی زندگی کا کھیل ہے جسے خدا اور آخرت سے غافل لوگ کھیل رہے ہیں۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ اسے سنجیدگی کے ساتھ نہیں سنتے بلکہ کھیل اور مذاق کے طور پر سنتے ہیں۔

۷۰ پھنسنے جاتے ہو یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے، اور دونوں ہی مطلب صحیح ہیں۔ سرگوشیاں گفتار مکہ کے وہ بڑے بڑے سردار آپس میں بیٹھ بیٹھ کر کیا کرتے تھے جن کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا مقابلہ کرنے کی بڑی نکر لاتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص بہر حال نبی تو ہو نہیں سکتا، کیونکہ ہم ہی جیسا انسان ہے، پیتا ہے، بازوؤں میں چلتا پھرتا ہے، بیری بچے رکھتا ہے۔ آخر اس میں وہ نرالی بات کیا ہے جو اس کو ہم سے ممتاز کرتی ہو۔ اور ہماری نسبت اس کو خدا سے ایک غیر معمولی تعلق کا مستحق بناتی ہو۔ البتہ اس شخص کی باتوں میں اور اس کی شخصیت میں ایک جادو ہے کہ جو اس کی بات کمان لگا کر سنتا ہے اور اس کے قریب جانا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر اپنی خیر چاہتے ہو تو نہ اس کی سنو اور نہ اس سے میل جول رکھو، کیونکہ اس کی باتیں سننا اور اس کے قریب جانا گویا آنکھوں دیکھنے جاؤ کہ چنندے میں پھنسا ہے۔

جس چیز کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھروسہ کا الزام چسپاں کرتے تھے اس کی چند مثالیں آپ کے قدیم ترین میرٹ نگار محمد بن اسحاق (متوفی ۱۵۲ھ) نے بیان کی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک دفعہ عتبہ بن ربیعہ نے سردار ابن قریش سے کہا، اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں محمد سے جا کر ملوں اور اسے سمجھانے کی کوشش کروں۔ یہ حضرت حمزہ کے اسلام لانے کے بعد کا واقعہ ہے جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی تعداد روز بروز بڑھتے دیکھ کر ان کا بڑبڑاہٹ سخت پریشان ہو رہے تھے۔ لوگوں نے کہا ابوالولید، تم پر پورا اطمینان ہے، ضرور جا کر اس سے بات کرو۔ وہ حضور کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، بیٹھے، ہمارے ہاں تم کو جو عزت حاصل تھی، تم خود جانتے ہو، اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو، تم نے جامعیت میں تفرقہ ڈال دیا اور انہی قوم کو بے وفور ٹھہرایا۔ اس کے دین اور اس کے ممبروں کی بھلائی کی۔ باپ دلو جو مرچکے ہیں ان سب کو تم نے

گمراہ اور کافر بنایا۔ بخینچے، اگر ان باتوں سے تمہارا مقصد دنیا میں اپنی بڑائی قائم کرنا ہے تو اوہم سب مل کر تم کو اتنا روپیہ دے دیتے ہیں کہ تم سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ۔ سرکاری چاہتے ہو تو ہم تمہیں سردار مانے لیتے ہیں۔ بادشاہی چاہتے ہو تو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔ اور اگر تمہیں کوئی بیماری ہو گئی ہے جس کی وجہ سے تم کو دوائی سوتے یا جلگتے میں کچھ نظر آنے لگا ہے تو ہم سب مل کر بہترین طبیعوں سے تمہارا علاج کر لے دیتے ہیں۔ یہ باتیں وہ کرتا رہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاموش سنتے رہے۔ جب وہ خوب بول چکا تو آپ نے فرمایا: ابوالولید، جو کچھ آپ کہنا چاہتے تھے کہہ چکے ہیں، یا اور کچھ کہنا ہے؟ اس نے کہا: بس جو کچھ کہنا تھا میں نے کہہ دیا، آپ نے فرمایا: اچھا اب میری سزا، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ حَمْدٌ، تَنْزِيلٌ مِنَ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ۔ اس کے بعد کچھ دیر تک مسلسل آپ سورۃ لحم السجدہ کی تلاوت فرماتے رہے اور عتبہ پیچھے زمین پر ہاتھ ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ اڑتیسویں آیت پر پہنچ کر آپ نے سجدہ کیا، اور پھر سر اٹھا کر عتبہ سے فرمایا: ابوالولید، جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ آپ نے سن لیا، اب آپ جانیں لو، آپ کا کام: عتبہ یہاں سے اٹھ کر سرطمان قریش کی طرف پلٹا تو لوگوں نے دُور سے ہی اس کو آنے دیکھ کر کہا: خدا کی قسم، ابوالولید کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر وہ گیا تھا: اُس کے پیچھے ہی لوگوں نے سوال کیا: کہو ابوالولید، کیا کر آئے؟ اُس نے کہا: خدا کی قسم، آج میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ واللہ! یہ شتر نہیں ہے، نہ سحر ہے، اور نہ کہانت۔ اُسے معشر قریش، میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اس کی باتیں جو میں نے سنی ہیں رنگ لاکر رہیں گی۔ اگر عرب اس پر غالب آگئے تو اپنے جیانی کا خون تمہاری گردن پر بہوگا، دو سروں پر بہوگا۔ اور اگر یہ عرب پر غالب آگیا تو اس کی حکومت تمہاری حکومت ہوگی اور اس کی عزت تمہاری عزت، لوگوں نے کہا: واللہ، ابوالولید تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔ اس نے کہا: یہ میری رائے ہے، اب تم جانو اور تمہارا کام: (ابن مہتمام، جلد اول، ص ۳۱۳-۳۱۴) یہی ہے اس واقعہ کے متعلق جو روایات جمع کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ جب حضور سورۃ لحم السجدہ کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے کہ فَإِنْ اعْرَفْتُمْوَأَفْكَلْ أَنْذَرْتُمْكُمْ ضِعْفَةً مِثْلَ صَاعِقَةٍ عَادٍ وَشُودٍ، تو عتبہ نے بے اختیار آگے بڑھ کر آپ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہنے لگا کہ خدا کے لیے اپنی توہم پر رحم کرو۔

رسول نے کہا میرا رب ہر اس بات کو جانتا ہے جو آسمان اور زمین میں کی جائے، وہ سمیع اور علیم ہے۔

دوسرا واقعہ ابن اسحاق نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ قبیلہ اراش کا ایک شخص کچھ اونٹ لے کر مکہ آیا۔ ابو جہل نے اس کے اونٹ خرید لیے اور جب اس نے قیمت طلب کی تو مال ٹول کرنے لگا۔ اراشی نے تنگ آکر ایک روز حرم کعبہ میں قریش کے سرداروں کو جا پکڑا اور مجمع عام میں فریاد شروع کر دی۔ دوسری طرف حرم کے ایک گوشے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرم تھے۔ سردارین قریش نے اس شخص سے کہا: ہم کچھ نہیں کر سکتے، دیکھو وہ صاحب جو اس کو نے میں بیٹھے ہیں، ان سے جا کر کہو، وہ تم کو تمہارا روپیہ دلوا دیں گے۔ اراشی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلا، اور قریش کے سرداروں نے آپس میں کہا: آج لطف آئے گا۔ اراشی نے جا کر حضور سے اپنی شکایت بیان کی آپ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے ساتھ لے کر ابو جہل کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ سرداروں نے پیچھے ایک آدمی لگا دیا کہ جو کچھ گندے اس کی خبر لا کر دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سیدھے ابو جہل کے دروازے پر پہنچے اور گندے کھٹکھٹائی۔ اس نے پوچھا: کون ہے آپ نے جواب دیا: محمدؐ۔ وہ حیران ہو کر باہر نکل آیا۔ آپ نے اس سے کہا: اس شخص کا حق ادا کرو۔ اس نے جواب میں کوئی چرن دھرانہ کی، اندر گیا اور اس کے اونٹوں کی قیمت لاکر اس کے ہاتھ میں دے دی۔ قریش کا مخز یہ حال دیکھ کر حرم کی طرف دوڑا اور سرداروں کو سارا ماجرا سنا دیا اور کہنے لگا کہ واللہ آج وہ عجیب معاملہ دیکھا جو کبھی نہ دیکھا تھا۔ حکم بن ہشام (ابو جہل) جب نکلا ہے تو محمدؐ کو دیکھتے ہی اس کا رنگ فق ہو گیا اور جب محمدؐ نے اس سے کہا کہ اس کا حق ادا کرو تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے حکم بن ہشام کے جسم میں جان نہیں ہے۔ (ابن ہشام، جلد ۲، ص ۲۹-۳۰)

یہ تھا شخصیت اور سیرت و کردار کا اثر اور وہ تھا کلام کا اثر، جس کو وہ لوگ جادو قرار دیتے تھے اور تاوانف لوگوں کو یہ کہہ کہہ کر ڈراتے تھے کہ اس شخص کے پاس نہ جانا ورنہ جادو کرے گا۔

یعنی رسول نے کبھی اس جھوٹے پروپیگنڈے اور سرگوشیوں کی اس مہم (WHISPERING CAMPAIGN) کا جواب اس کے سوا نہ دیا کہ تم لوگ جو باتیں بتاتے ہو سب کچھ خدا سنتا اور جانتا ہے، خواہ زور سے کہو، خواہ چپکے چپکے کانوں میں چھونکو۔ وہ کبھی بے انصاف، دشمنوں کے مقابلے میں ترک کی بزرگی جواب دینے پر نہ اتر آیا۔

وہ کہتے ہیں ”بلکہ یہ پراگندہ خواب ہیں، بلکہ یہ اس کی من گھڑت ہے، بلکہ یہ شخص شاعر ہے۔“ ورنہ

عہ اس کا پس منظر یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا اثر جب پھیلنے لگا تو مکہ کے سرداروں نے آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ آپ کے مقابلے میں پروپیگنڈا کی ایک مہم شروع کی جائے اور ہر اس شخص کو جو مکہ میں زیارت کے لیے آئے، آپ کے خلاف پہلے ہی سے اتنا بدگمان کر دیا جائے کہ وہ آپ کی بات سننے کے لیے آمادہ ہی نہ ہو۔ یہ مہم ویسے تو بارہ چھینے بیاری رہتی تھی، مگر خاص طور پر حج کے زمانے میں کثرت سے آدمی پھیلا دیتے جاتے تھے جو تمام بیرونی زائرین کے خیچوں میں پہنچ کر ان کو خبردار کرتے پھرتے تھے کہ یہاں ایسا ایسا ایک آدمی ہے اس سے ہوشیار رہنا۔ ان گفتگوؤں میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی تھیں۔ کبھی کہا جاتا کہ یہ شخص جادو گر ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ ایک کلام اس نے خود گھڑ رکھا ہے اور کہتا ہے۔ خدا کا کلام ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ اجی وہ کلام کیا ہے، دیوانوں کی بڑ اور پراگندہ خیالات کا پندا ہے۔ کبھی کہا جاتا کہ شاعرانہ خیالات اور تک بندیاں ہیں جن کا نام اُس نے کلام الہی رکھا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح لوگوں کو بہکا یا جائے۔ صداقت کا ان کے سامنے سرے سے کوئی سوال ہی نہ تھا کہ ہم کہ کوئی قطعی اور صحیحی رائے ظاہر کرتے۔ لیکن اس جھوٹے پروپیگنڈے کا حاصل جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام انہوں نے خود ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیا۔ آپ کی جتنی شہرت مسلمانوں کی کوششوں سے سالہا سال میں بھی نہ ہو سکتی تھی وہ قریش کی اس مخالفانہ مہم سے تھوڑی مدت ہی کے اندر ہو گئی۔ ہر شخص کے دل میں ایک سوال پیدا ہو گیا کہ آخر معلوم تو ہو رہا کہ ان ایسا آدمی ہے جس کے خلاف یہ طوفان برپا ہے، اور بہت سے سوچنے والوں نے سوچا کہ اس شخص کی بات سنی تو جائے، ہم کوئی نیچے تو نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ بہک جائیں گے۔

اس کی ایک دلچسپ مثال طفیل بن عمرو دوسی کا قصہ ہے جسے ابن اسحاق نے خود ان کی روایت سے بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں قبیلہ دوس کا ایک شاعر تھا۔ کسی کام سے مکہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی قریش کے چند لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف خوب میرے کان بھرے یہاں تک کہ میں آپ سے سخت بدگمان ہو گیا اور میں نے طے کر لیا کہ آپ سے بچ کر ہی رہوں گا۔ دوسرے روز میں نے حرم میں ماضی دی تو آپ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے۔ میرے کانوں میں چند جملے جو پڑے تو میں نے محسوس کیا

یہ لاشے کوئی نشانی جس طرح پرانے زمانے کے رسول نشانیوں کے ساتھ بھیجے گئے تھے۔ حالانکہ ان سے کہ یہ تو کوئی بڑا اچھا کلام ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں شاعر ہوں، جوان مرد ہوں، عقل رکھتا ہوں، کوئی تجربہ نہیں ہوں کہ صبح اور غلط میں تمیز نہ کر سکوں۔ آخر کیوں نہ اس شخص سے مل کر معلوم کروں کہ یہ کہنا کیا ہے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہو کر واپس چلے تو میں آپ کے پیچھے پیچھے ہو گیا اور آپ کے مکان پر پہنچ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے متعلق مجھ سے یہ یہ کچھ کہا تھا، اور میں آپ سے اس قدر بدگمان ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے کانوں میں روٹی ٹھونس لی تھی تاکہ آپ کی آواز نہ سننے پاؤں۔ لیکن ابھی جو چند کلمے میں نے آپ کی زبان سے سنے ہیں وہ مجھے کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ آپ مجھے ذرا تفصیل سے بتائیے، آپ کیا کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں مجھ کو قرآن کا ایک حصہ سنایا اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ اسی وقت ایمان لے آیا۔ پھر واپس جا کر میں نے اپنے باپ اور بیوی کو مسلمان کیا۔ اس کے بعد اپنے قبیلے میں مسلسل اشاعت اسلام کرتا رہا، یہاں تک کہ غزوہ خندق کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے میرے قبیلے کے شرابی گھرانے مسلمان ہو گئے۔ (ابن ہشام جلد ۲، ص ۲۲-۲۳)

ایک اور روایت جو ابن اسحاق نے نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سردارانِ قریش اپنی محفلوں میں خود اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ جو باتیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بتاتے ہیں وہ محض جھوٹ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مجلس میں نضر بن حارث نے تقریر کی کہ تم لوگ محمدؐ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو اس سے کام نہ چلے گا۔ وہ جب تمہارے درمیان تو عمر جو ان تھا تو تمہارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب کہ اس کے بال سفید ہونے کو لگے، تم کہتے ہو یہ ساحر ہے، کاہن ہے، شاعر ہے، مجنون ہے۔ بخدا، وہ ساحر نہیں ہے، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھار چوڑک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے، ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور حبیبی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں ان کا ہمیں علم ہے۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے، مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور حبیبی بے تکی بڑوہ لاکھتا ہے کیا اس سے ہم بے خبر ہیں۔ اے سردارانِ قریش، کچھ اور بات سوچو، جس چیز کا مقابلہ نہیں دیکھا ہے وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو۔ اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ تم سے

پہلے کوئی بستی بھی، جسے ہم نے ہلاک کیا، ایمان نہ لائی۔ اب کیا یہ ایمان لائیں گے؟
اور اے محمد، تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم وحی کیا کرتے
تھے۔ تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم
نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں، اور زورہ سدا جینے والے تھے۔ پھر دیکھ لو کہ آخر کار ہم نے ان کے
ساتھ اپنے دوسرے پورے کیے، اور انہیں درجین آدمیوں نے چاہا بچا لیا، اور عدسے گزر جانے والوں

رتنہ اور اسفندہ یا بکے قصے لاکر پھیلانے جائیں تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انہیں قرآن سے زیادہ محسب
معلوم ہوں چنانچہ کچھ دنوں اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔ (راہن ہشام۔ جلد اول
ص ۲۲۰-۲۲۱)

۱۰۔ اس مختصر سے جملے میں نشانی کے مطالبے کا جو جواب دیا گیا ہے وہ تین مضمونوں پر مشتمل ہے۔
ایک یہ کہ تم پچھلے رسولوں کی سی نشانیاں مانگتے ہو، مگر یہ بھول جاتے ہو کہ ہرٹ و حرم لوگ ان نشانوں کو دیکھ کر
بھی ایمان نہ لائے تھے۔ دوسرے یہ کہ تم نشانی کا مطالبہ تو کرتے ہو، مگر یہ یاد نہیں رکھتے کہ جس قوم نے بھی مریخ
موجزہ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد ایمان لانے سے انکار کیا ہے وہ پھر ہلاک ہوئے بغیر نہیں رہی ہے تیسرے
یہ کہ تمہاری منہ مانگی نشانی نہ بھیجنا تو تم پر خدا کی ایک بڑی مہربانی ہے۔ اب تک تم انکار پر انکار کیے جاتے رہے
اور تیلانے عذاب نہ ہوئے۔ کیا اب نشانی اس لیے مانگتے ہو کہ ان قوموں کا سا انجام دیکھو جو نشانیاں دیکھ کر
بھی ایمان نہ لائیں اور تباہ کر دی گئیں؟

۱۱۔ یہ جواب ہے ان کے اس قول کا کہ یہ شخص تم جیسا ایک بشر ہی تو ہے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کی بشریت کو اس بات کی دلیل قرار دیتے تھے کہ آپ نبی نہیں ہو سکتے۔ جواب دیا گیا کہ پہلے زمانے کے جن
لوگوں کو تم خود ماننے ہو کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے تھے، وہ سب بھی بشر ہی تھے اور بشر ہونے ہوئے ہی
خدا کی وحی سے سرفراز ہوئے تھے۔

۱۲۔ یعنی یہ یہودی، جو آج اسلام کی دشمنی میں تمہارے ہم نوا ہیں اور تم کو مخالفت کے داعی پر سکھایا کرتے

کو ہلاک کر دیا۔

لوگو، ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟

کتنی ہی ظالم بستیاں ہیں جن کو ہم نے پیس کر رکھ دیا اور ان کے بعد دوسری کسی قوم کو اٹھایا جب ان کو سہارا عذاب محسوس ہوا تو لگے سر پٹ دوڑتے۔ (کہا گیا) ”بھاگو نہیں۔ جاؤ اپنے انہی گھروں اور عیش کے سامانوں میں جن کے اندر تم چین کر رہے تھے، شاید کہ تم سے پوچھا جائے“ کہنے لگے

ہیں، انہی سے پوچھ لو کہ موسیٰ اور دوسرے انبیاء بنی اسرائیل کون تھے۔ انسان ہی تھے یا کوئی اور مخلوق؟

اللہ یعنی کھلی تاریخ کا سبق صرف اتنا ہی نہیں بتانا کہ پہلے جو رسول بھیجے گئے تھے وہ انسان تھے، بلکہ یہ بھی بتانا ہے کہ ان کی نصرت و تائید کے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کو ہلاک کر دینے کے، جتنے وعدے اللہ نے ان سے کیے تھے وہ سب پورے ہوئے اور ہر وہ قوم برباد ہوئی جس نے ان کو نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ اب تم اپنا انجام خود سوچ لو۔

اللہ یہ اکتھا جواب ہے کفار مکہ کے ان تمام مضطرب احوال کا جو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے تھے کہ یہ شاعری ہے، یہ ساحری ہے، یہ پراگندہ خواب ہیں، یہ من گھڑت افسانے ہیں، وغیرہ۔ اس پر فرمایا جا رہا ہے کہ اس کتاب میں آخر وہ کونسی نرالی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہ آتی ہو، جس کی وجہ سے اس کے متعلق تم اتنی متضاد رائیں قائم کر رہے ہو۔ اس میں تو تمہارا اپنا ہی حال بیان کیا گیا ہے۔ تمہارے نفسیات اور تمہارے ہی معاملات زندگی زیر بحث ہیں۔ تمہاری ہی فطرت اور ساخت اور آغاز و انجام پر گفتگو ہے۔ تمہارے ہی ماحول سے وہ نشانیاں چن چن کر پیش کی گئی ہیں جو حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ اور تمہارے ہی اخلاقی اوصاف میں سے فضائل اور تباہ کافرق نمایاں کر کے دکھایا جا رہا ہے جس کے صحیح ہونے پر تمہارے اپنے ضمیر گواہی دیتے ہیں۔ ان سب باتوں میں کیا چیز ایسی گنجلک اور پیچیدہ ہے کہ اس کو سمجھنے سے تمہاری عقل عاجز ہو؟

اللہ یعنی جب عذاب الہی سر پر آگیا اور انہیں معلوم ہو گیا کہ آگئی شامت۔

اللہ نہایت معنی خیز فقرہ ہے اور اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: ذرا اچھی طرح اس عذاب کا معائنہ

ہاٹے ہماری کم نجاتی، بے شک ہم خطا وار تھے، اور وہ یہی پکارتے رہے یہاں تک کہ ہم نے ان کو کھلیاں کر دیا، زندگی کا ایک شرارہ تک ان میں نہ رہا۔

ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ بھی ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگاتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔ اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

کہو تاکہ کل کوئی اس کی کیفیت پر چھے تو ٹھیک بتا سکو۔ اپنے وہی ٹھاٹھ جاکر پھر مجلسیں گرم کرو، شاید اب بھی تمہارے عزم و حزم ہاتھ باندھ کر پوچھیں کہ حضور کیا حکم ہے۔ اپنی وہی کونسلیں اور کیتھیاں جمانے بیٹھے رہو، شاید اب بھی تمہارے عقائد مشوروں اور مدبرانہ آراء سے استفادہ کرنے کے لیے دنیا حاضر ہو۔

یہ تبصرہ ہے ان کے اس پیدے نظریہ حیات پر جس کی وجہ سے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر توجہ نہ کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ انسان دنیا میں بس یہی آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ جو کچھ چاہے کرے اور جس طرح چاہے جیسے۔ کوئی باز پرس اس سے نہیں ہونی ہے۔ کسی کو اسے حساب نہیں دینا ہے۔ چند روز کی بھلی بری زندگی گزار کر سب کو بس یہی بھلا ہونا ہے۔ کوئی دوسری زندگی نہیں ہے جس میں بھلائی کی جزا اور برائی کی سزا ہو۔ یہ خیال درحقیقت اس بات کا ہم مہنی تھا کہ کائنات کا یہ سارا نظام محض کسی کھنڈرے کا کھیل ہے جس کا کوئی سنجیدہ مقصد نہیں ہے۔ اور یہی خیالی دعوت پیغمبر سے ان کی بے اعتنائی کا اصل سبب تھا۔

یعنی ہمیں کھینا ہی ہوتا تو کھلونے بنا کر ہم خود ہی کھیل لیتے۔ اس صورت میں یہ ظلم تو ہرگز نہ کیا جاتا کہ خواہ مخواہ ایک ذی حس، ذی شعور، ذمہ دار مخلوق کو پیدا کر ڈالا جاتا۔ اس کے درمیان حق و باطل کی یہ کشمکشیں اور کھینچا تانیاں کرائی جاتیں، اور محض اپنے لطف و تفریح کے لیے ہم دوسروں کو بلا و تیرہ تکلیفوں میں ڈالنے۔ تمہارے خدانے یہ دنیا کچھ رومی اکھاڑے (COLOSSEUM) کے طور پر نہیں بنائی ہے کہ بندوں کو دزدوں سے لڑوا کر اور ان کی بوٹیاں پھونکا کر خوشی کے ٹھٹھے لگائے۔

یعنی ہم بازی کر رہے ہیں، نہ ہمارا کام کھیل تھا تاکرنا ہے۔ ہماری یہ دنیا ایک سنجیدہ نظام ہے

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے۔ اور جو فرشتے، اس کے پاس ہیں وہ نہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر اس کی بندگی سے مترانی کرتے ہیں اور نہ ملول ہوتے ہیں۔ شب و روز اس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں، دم نہیں لیتے۔

جس میں کوئی باطل چیز جم نہیں سکتی۔ باطل یہاں جب بھی سر اٹھاتا ہے، حقیقت سے اس کا تصادم ہو کر رہتا ہے اور آخر کار وہ منٹ کر ہی رہتا ہے۔ اس دنیا کو اگر تم تماشا گاہ سمجھ کر چھو گے، یا حقیقت کے خلاف باطل نظر لیتا پر کام کر دو گے تو نتیجہ تمہاری اپنی ہی تباہی ہو گا۔ نوع انسانی کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لو کہ دنیا کو محض ایک تماشا گاہ، محض ایک خزانہ لٹیا، محض ایک عیش کدہ سمجھ کر جینے والی، اور انبیاء کی بتائی ہوئی حقیقت سے منہ موڑ کر باطل نظریات پر کام کرنے والی قومیں پے در پے کس انجام سے دو چار ہوتی رہی ہیں۔ پھر یہ کونسی عقلندی ہے کہ جب سمجھانے والا سمجھاٹے تو اس کا مذاق اڑاؤ، اور جب اپنے ہی کیے کر تو توں کے نتائج عذاب الہی کی صورت میں سر پر آجائیں تو چیخنے لگو کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطا وار تھے۔“

۱۴۸ یہاں سے توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال پر گفتگو شروع ہوتی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے درمیان اصل بنائے نزاع تھی۔ اب مشرکین مکہ کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات کا یہ نظام جس میں تم جی رہے ہو جس کے متعلق ابھی یہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ کسی کھلڈرے کا کھلونا نہیں ہے، جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ ایک سنجیدہ اور با مقصد اور معنی بر حقیقت نظام ہے، اور جس کے متعلق یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس میں باطل ہمیشہ حقیقت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے، اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس پورے نظام کا خالق، مالک، حاکم اور رب صرف ایک خدا ہے، اور اس حقیقت کے مقابلے میں باطل یہ ہے کہ اسے بہت سے خداؤں کی مشترک سلطنت سمجھا جائے، یا یہ خیال کیا جائے کہ ایک بڑے خدا کی خدائی میں دوسرے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا بھی کچھ دخل ہے۔

۱۴۹ یعنی وہی فرشتے جن کو مشرکین عرب خدا کی اولاد سمجھ کر، یا خدائی میں ذخیل مان کر معبود بنائے ہوئے تھے۔ ۱۴۸ یعنی خدا کی بندگی کرنا ان کو ناگوار بھی نہیں ہے کہ بادل ناخواستہ بندگی کرتے کرتے وہ ملول ہو جاتے ہوں۔ اصل میں لفظ لا یتخسرون استعمال کیا گیا ہے۔ استخسار میں تکان کا مبالغہ پایا جاتا ہے اور

کیا ان لوگوں کے بنائے ہوئے اصنی خدا ایسے ہیں کہ بے جان کو جان بخش کر، اٹھا کھڑا کرتے ہوں؟
اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا دوسرے خدا بھی ہوتے تو زمین اور آسمان دونوں کا نظام بگڑ جاتا۔
اس سے مراد وہ مکان ہے جو کسی ناگوار کام کے کرنے سے لائق ہوتی ہے۔

لہذا اصل میں لفظ "ینشرون" استعمال ہوا ہے جو "انتشار" سے مشتق ہے۔ انتشار کے معنی ہیں بے جان پڑی ہوئی چیز کو اٹھا کھڑا کرنا۔ اگرچہ اس لفظ کو قرآن مجید میں بالعموم زندگی بعد موت کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لیکن اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر، اصل لغوی معنی کے اعتبار سے یہ لفظ بے جان مادے میں زندگی چھونک دینے کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔ اور موقع و محل کو دیکھتے ہوئے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو انہوں نے خدا قرار دے رکھا ہے اور اپنا معبود بنایا ہے، کیا ان میں کوئی ایسا ہے جو مادہ غیر ذی حیات میں زندگی پیدا کرتا ہو؟ اگر ایک اللہ کے سوا کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔ اور مشرکین عرب خود مانتے تھے کہ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے۔ تو پھر وہ ان کو خدا اور معبود کس لیے مان رہے ہیں؟

لہذا یہ استدلال سادہ سچی ہے اور بہت گہرا بھی۔ سادہ سی بات، جس کو ایک بدوی، ایک دیہاتی، ایک موٹی سی سمجھ کا آدمی بھی باسانی سمجھ سکتا ہے، یہ ہے کہ ایک معمولی گھر کا نظام بھی چار دن غیریت نہیں چل سکتا اگر اس کے دو صاحب خانہ ہوں۔ اور گہری بات یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام، زمین کی تہوں سے لے کر بعید ترین سیاروں تک، ایک ہمہ گیر قانون پر چل رہا ہے۔ یہ ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہیں رہ سکتا اگر اس کی بے شمار مختلف قوتوں اور بے حد حساب چیزوں کے درمیان تناسب اور توازن اور ہم آہنگی اور تعاون نہ ہو۔ اور یہ سب کچھ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ کوئی اٹل اور غالب وقابض ضابطہ ان بے شمار اشیا اور قوتوں کو پوری مناسبت کے ساتھ باہم کام کرتے رہنے پر مجبور کر رہا ہو۔ اب یہ کس طرح تصور کیا جاسکتا ہے کہ بہت سے مطلق العنان فرمانرواؤں کی حکومت میں ایک ضابطہ اس باقاعدگی کے ساتھ چل سکے۔ نظم کا وجود خود ہی ناظم کی وحدت کو مستلزم ہے۔ قانون اور ضابطہ کی ہمہ گیری آپ ہی اس بات پر شاہد ہے کہ اختیارات ایک ہی حاکمیت میں مرکوز ہیں اور وہ حاکمیت مختلف حاکموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔

پس پاک ہے اللہ رب العرش اُن باتوں سے جو یہ لوگ بنا رہے ہیں۔ وہ اپنے کاموں کے لیے
رکسی کے آگے، جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

کیا اُسے چھوڑ کر انہوں نے دوسرے خدا بنا لیے ہیں؟ اے محمد، ان سے کہو کہ لاؤ اپنی
دلیل، یہ کتاب بھی موجود ہے جس میں میرے دور کے لوگوں کے لیے نصیحت ہے اور وہ کتابیں
بھی موجود ہیں جن میں مجھ سے پہلے لوگوں کے لیے نصیحت تھی۔ مگر ان میں سے اکثر لوگ حقیقت
سے بے خبر ہیں اس لیے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اُس کے
بہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تم میری ہی بندگی کرو۔

یہ کہتے ہیں رحمن اولاد رکھتا ہے۔ سبحان اللہ، وہ تو بندے ہیں جنہیں عزت دی گئی ہے۔
اُس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اُس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ جو کچھ اُن کے سامنے ہے اُسے
بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے ادھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وہ کسی کی سفارش نہیں
کرتے بجز اُس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو، اور وہ اس کے خوف سے ڈرے

۱۳۰ رب العرش یعنی کائنات کے تخت سلطنت کا مالک۔

۱۳۱ پہلے دوا استدلال عقلی تھے۔ اور یہ استدلال عقلی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج تک جتنی کتابیں بھی خدا کی
طرف سے دنیا کے کسی ملک میں کسی قوم کے پیغمبر پر نازل ہوئی ہیں، ان میں سے کسی میں یہ نکال کر دکھاؤ کہ اللہ
خالق زمین و آسمان کے سوا کوئی دوسرا بھی خدائی کا کوئی شائبہ رکھتا ہے اور کسی اور کو بھی بندگی و عبادت کا حق
پہنچتا ہے۔ پھر یہ کیسا مذہب تم لوگوں نے بنا رکھا ہے جس کی تائید میں نہ عقل سے کوئی دلیل ہے اور نہ آسمانی
کتابیں ہی جس کے لیے کوئی شہادت فراہم کرتی ہیں۔

۱۳۲ ہلکہ یعنی نبی کی بات پر ان کا توجہ نہ کرنا علم پر نہیں بلکہ جہل پر مبنی ہے۔ حقیقت سے بے خبر ہیں، اس
لیے سمجھانے والے کی بات کو ناقابل التفات سمجھتے ہیں۔

۱۳۳ یہاں پھر فرشتوں ہی کا ذکر ہے جن کو مشرکین عرب خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ بعد کی تقریر سے یہ

بات خود ظاہر ہو جاتی ہے۔

رہتے ہیں۔ اور جو ان میں سے کوئی کہہ دے کہ اللہ کے سوا میں بھی ایک خدا ہوں تو اسے ہم جہنم کی سزا دیں، ہمارے ہاں ظالموں کا یہی بدلہ ہے یہ

کیا وہ لوگ جہنم نے (نبی کی بات ماننے سے) انکار کر دیا ہے غور نہیں کرتے کہ یہ سب آسمان اور زمین یا ہم ملے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا، اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی۔

۷۷ مشرکین فرشتوں کو دو جوہ سے معبود بناتے تھے۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک وہ خدا کی اولاد تھے۔ دوسرے یہ کہ وہ ان کی پرستش (خوشامد) کر کے انہیں خدا کے ہاں اپنا شفیق (سفارشی) بنا تا چاہتے تھے۔ ویقولون ھولاء شفعاؤنا عند اللہ (یونس۔ رکوع ۲) اور مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِيُقْرِبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰی (الزمر۔ رکوع ۱)۔ ان آیات میں دونوں وجوہ کی تردید کر دی گئی ہے۔

اس جگہ یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن بالعموم شفاعت کے مشرکانہ عقیدے کی تردید کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ جہنم تم شفیق قرار دیتے ہو وہ علم غیب نہیں رکھتے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ان باتوں کو بھی جانتا ہے جو ان کے سامنے ہیں اور ان باتوں کو بھی جو ان سے اوجھل ہیں۔ اس سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ آفران کو سفارش کرنے کا مطلق اور غیر مشروط اختیار کیسے حاصل ہو سکتا ہے جبکہ وہ ہر شخص کے اگلے پچھلے اور پوشیدہ و ظاہر حالات سے واقف نہیں ہیں۔ اس لیے خواہ فرشتے ہوں یا انبیاء و صالحین، ہر ایک کا اختیار شفاعت لازماً اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی کے حق میں شفاعت کی اجازت دے۔ بطور خود برکس و ناکس کی شفاعت کر دینے کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ اور جب شفاعت سننا یا نہ سننا اور اسے قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اللہ کی مرضی پر موقوف ہے تو ایسے بے اختیار شفیق اس قابل کہہ سکتے ہیں کہ ان کے آگے مہربان ہجکایا جائے اور دست سوال دراز کیا جائے۔

۷۸ اصل میں "رتق" اور "فتق" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ رتق کے معنی ہیں یکجا ہونا، اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فتق کے معنی پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ بظاہر ان الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کی ابتدائی شکل ایک توڑے (MASS) کی سی تھی، بعد میں اس کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنا دیے گئے۔

کیا وہ درہماری اس خلتی کو نہیں مانتے؟ اور ہم نے زمین میں پہاڑ جھاڑ دیئے تاکہ وہ انہیں لے کر ڈھک نہ جائے، اور اس میں کشادہ راہیں بنا دیں، شاید کہ لوگ اپنا راستہ معلوم کر لیں۔ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ پھت بنا دیا، مگر یہ ہیں کہ اس کی نشانیوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔ اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے اور سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک الگ الگ میں تیرے ہیں۔

۱۵۹ اس سے جو مفہوم سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ پانی کہ خدا نے سبب زندگی اور اصل حیات بنایا، اسی میں اور اسی سے زندگی کا آغاز کیا۔ دوسری جگہ اس مطلب کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، **وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَابَّةٍ مِّنْ مَّاءٍ (النور - رکوع ۱)** اور خدا نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا۔

۱۶۰ اس کی تشریح سورہ نخل میں گزر چکی ہے، ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲۔

۱۶۱ یعنی پہاڑوں کے درمیان ایسے درے رکھ دیئے اور دریا نکال دیئے جن کی وجہ سے پہاڑی علاقوں سے گزرنے اور زمین کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف عبور کرنے کے راستے نکل آتے ہیں۔ اسی طرح زمین کے دوسرے حصوں کی ساخت بھی ایسی رکھی ہے کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنے کے لیے راہ بن جاتی ہے یا بنالی جاسکتی ہے۔

۱۶۲ ذومعنی فقرہ ہے۔ یہ مطلب بھی ہے کہ لوگ زمین میں چلنے کے لیے راہ پائیں، اور یہ بھی کہ وہ اس حکمت اور اس کاریگری اور اس انتظام کو دیکھ کر حقیقت تک پہنچنے کا راستہ پالیں۔

۱۶۳ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو سورہ الحج، حواشی نمبر ۸، ۱۰، ۱۱، ۱۲۔

۱۶۴ یعنی ان نشانیوں کی طرف جو آسمان میں ہیں۔

۱۶۵ کُلُّ اور لیسبتوں کے الفاظ بتاتے ہیں کہ مراد صرف سورج اور چاند ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے اجرام فلکی، یعنی تارے بھی مراد ہیں، ورنہ جمع کے بجائے تشبیہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا۔ فلک جو فارسی کے چرخ اور گروں کا ٹیکہ ہم معنی ہے، عربی زبان میں آسمان کے معروف ناموں میں سے ہے۔ سب ایک ایک فلک میں تیرے ہیں۔ سے دو باتیں صاف سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ سب تارے ایک ہی فلک میں نہیں ہیں بلکہ ہر ایک کا فلک الگ ہے۔ دوسرے یہ کہ فلک کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس میں یہ تارے کھوٹیوں کی طرح بٹے ہوئے

اور اسے محمدؐ، ہمیشگی توہم نے تم سے پہلے بھی کسی انسان کے لیے نہیں رکھی ہے، اگر تم مر گئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ جیتے رہیں گے؟ ہر جاندار کو موت کا فرہ چکھنا ہے، اور ہم اچھے اور بُرے ہوں اور وہ خود انہیں لیے ہوئے گھوم رہا ہو بلکہ وہ کوئی سیال شے ہے یا فضا اور خلا کی سی نوعیت کی چیز ہے جس میں ان تاروں کی حرکت تیرنے کے فعل سے مشابہت رکھتی ہے۔

قدیم زمانے میں لوگوں کے لیے آسمان وزمین کے رتق وفتق، اور پانی سے ہر زندہ چیز کے پیدا کیے جانے، اور تاروں کے ایک ایک خٹک میں تیرنے کا مفہوم کچھ اور تھا، موجودہ زمانے میں طبیعیات (PHYSICS) حیاتیات، (BIOLOGY) اور علم سمیٹ (ASTRONOMY) کی جدید معلومات نے ہمارے لیے ان کا مفہوم کچھ اور کر دیا ہے، اور نہیں کہہ سکتے کہ آگے چل کر انسان کو جو معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ ان الفاظ کے کن معانی پر روشنی ڈالیں گی۔ بہر حال موجودہ زمانے کا انسان ان تینوں آیات کو بالکل اپنی جو بہترین معلومات کے مطابق پاتا ہے۔

اس مقام پر یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ وَكَلْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِنْ لَدُنْكَ نَحْنُ الظَّالِمِينَ تک کی تقریرِ شرک کی تردید میں ہے، اور أَوْلَمَبَرَّالَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ لَدُنْكَ يَسْبِقُونَ تک جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں توحید کے لیے اِجْبَابِي (POSITIVE) دلائل دیئے گئے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ یہ نظام کائنات جو تمہارے سامنے ہے، کیا اس میں کہیں ایک اللہ رب العالمین کے سوا کسی اور کی بھی کوئی کارگیری تمہیں نظر آتی ہے؟ کیا یہ نظام ایک سے زیادہ خداؤں کی کار فرمائی میں بن سکتا تھا اور اس بناقاعدگی کے ساتھ جاری رہ سکتا تھا؟ کیا اس حکیمانہ نظام کے متعلق کوئی صاحبِ عقل و خرد آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ ایک کلنڈرے کا کھیل ہے اور اس نے محض تفریح کے لیے چند گڑیاں بنائی ہیں جن سے کچھ مدت کھیل کہ بس وہ بونہی ان کو خاک میں ملا دے گا؟ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو اور پھر بھی نبی کی بات مانتے سے انکار کیے جاتے ہو؟ تم کو نظر نہیں آتا کہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز اس نظریہ توحید کی شہادت دے رہی ہے جو یہ نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے؟

۱۵۳ یہاں سے پھر سلسلہ تقریر اس کشمکش کی طرف مڑتا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مخالفین کے درمیان برپا تھی

حالات میں ڈال کر تم سب کی آزمائش کر رہے ہیں۔ آخر کار تمہیں بیماری ہی طرف پلٹنا ہے۔
یہ منکرین حق حیب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ کہتے ہیں "کیا یہ ہے وہ شخص جو تمہارے
خداؤں کا ذکر کیا کرتا ہے؟" اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ رحمان کے ذکر سے منکر ہیں۔

۳۷ یہ مختصر جواب ہے ان ساری دھمکیوں اور بدوعلیوں اور کوسنوں اور قتل کی سازشوں کا جن سے ہر وقت نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کی نراضی کی جاتی تھی۔ ایک طرف اکابر قریش تھے جو آٹے دن آپ کو اس تبلیغ کے خوفناک نتائج کی دھمکیاں دیتے
رہتے تھے، اور ان میں سے بعض پر جوش مخالفین بیٹھ بیٹھ کر یہ تک سوچا کرتے تھے کہ کسی طرح آپ کا کام تمام کر دیں۔
دوسری طرف ہر وہ گھر جس کا کوئی فرد اسلام قبول کر لیتا تھا، آپ کا دشمن بن جاتا تھا۔ اس کی عورتیں آپ کو کلپ کلپ
کو سنتی اور بدو عایش دیتی تھیں اور اس کے مرد آپ کو ڈرا دے دیتے پھرتے تھے۔ خصوصاً ہجرت حبشہ کے بعد تو کتے
بھر کے گھروں میں کہرام مچ گیا تھا، کیونکہ مشکل ہی سے کوئی ایسا گھر بنا بچا رہ گیا تھا جس کے کسی لڑکے یا لڑکی نے
ہجرت نہ کی ہو۔ یہ سب لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کی دُہائیاں دیتے تھے کہ اس شخص نے ہمارے گھر برباد
کیے ہیں۔ انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے، اور ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یقین کی گئی ہے
کہ تم ان کی پروا کیے بغیر، بے خوف اپنا کام کیے جاؤ۔

۳۸ یعنی راحت اور رنج، مغلسی اور امیری، غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف، صحت اور بیماری، غرض تمام
مختلف حالات میں تم لوگوں کی آزمائش کی جا رہی ہے، تاکہ دیکھیں تم اچھے حالات میں منکر، ظالم، خدا فراموش،
بندہ نفس تو نہیں بن جاتے، اور بُرے حالات میں کم سمی کے ساتھ پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے تو
اختیار نہیں کرنے لگتے۔ لہذا کسی صاحب عقل آدمی کو ان مختلف حالات کے سمجھنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے جو
حالت بھی اسے پیش آئے، اُس کے امتحانی اور آزمائشی پہلو کو نگاہ میں رکھنا چاہیے اور اس سے بھیرت گزرنے کی
کوشش کرنی چاہیے۔ یہ صرف ایک احمق اور کم ظرف آدمی کا کام ہے کہ جب اچھے حالات آئیں تو فرعون بن
جائے، اور جب بُرے حالات پیش آجائیں تو زمین پر ناک رگڑنے لگے۔

۳۹ یعنی برائی کے ساتھ اُن کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ یہ فقرہ اُن کے مذاق کا مضمون
نہیں بتا رہا ہے، بلکہ مذاق اڑانے کی وجہ اور بنیاد پر روشنی ڈال رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فقرہ بجائے خود کوئی

انسان جلدی بازہ مخلوق ہے۔ ابھی میں تم کو اپنی نشانیاں دکھائے دیتا ہوں، جلدی نہ مچاؤ۔^{۱۵۲}
یہ لوگ کہتے ہیں "آخر یہ دھمکی پوری کب ہوگی اگر تم سچے ہو" کاش ان کافروں کو اُس وقت کا کچھ
علم ہوتا جبکہ یہ نہ اپنے منہ آگ سے بچاسکیں گے نہ اپنی پیٹھیں، اور نہ کہیں سے ان کو مدد پہنچے گی۔
وہ بلا اچانک آئے گی اور انہیں اس طرح یک لخت دبوچ لے گی کہ یہ نہ اُس کو دفع کرسکیں گے اور

مذاق کا فقرہ نہیں ہے۔ مذاق تو وہ دوسرے ہی الفاظ میں اڑاتے ہونگے اور کچھ اور ہی طرح کے آوازے کتے اور
فقرے سمیت کرتے ہونگے۔ البتہ یہ سارا دل کا بخارجس وجہ سے نکالا جاتا تھا وہ یہ تھی کہ آپ ان کے خود ساختہ
معبودوں کی خدائی کا رو کرتے تھے۔

۱۵۳ یعنی بتوں اور بناوٹی خداؤں کی مخالفت تو انہیں اس قدر ناگوار ہے کہ اُس کا بدلہ لینے کے لیے تمہاری
تضعیک و تذلیل کرتے ہیں، مگر انہیں خود اپنے حال پر شرم نہیں آتی کہ خدا سے پھرے ہوئے ہیں اور اس کا ذکر
سن کر آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔

۱۵۴ اصل میں خَلِقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَجَلٍ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کا اعلیٰ ترجمہ ہے "انسان جلدی باز"
سے بنایا گیا، یا پیدا کیا گیا ہے" لیکن یہ لفظی معنی اصل مقصود کلام نہیں ہیں۔ جس طرح ہم اپنی زبان میں کہتے ہیں کہ
فلاں شخص عقل کا پتلا ہے، اور فلاں شخص حرفوں کا بنا ہوا ہے، اسی طرح عربی زبان میں کہتے ہیں کہ وہ فلاں چیز
سے پیدا کیا گیا ہے، اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ فلاں چیز اُس کی سرشت میں ہے۔ یہی بات جس کو یہاں خَلِقَ
الْاِنْسَانَ مِنْ عَجَلٍ کہہ کر ادا کیا گیا ہے، دوسری جگہ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا، "انسان جلدی باز واقع ہوا ہے" دینی
اسرائیل، رکو ۲۷ کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

۱۵۵ بعد کی تقریر صاف بتا رہی ہے کہ یہاں "نشانوں" سے کیا مراد ہے۔ وہ لوگ جن باتوں کا مذاق اڑاتے
تھے اُن میں سے ایک عذاب الہی، اور قیامت اور جہنم کا مضمون بھی تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ شخص آٹے دن میں
ڈراوے دیتا ہے کہ میرا انکار کرو گے تو خدا کا عذاب ٹوٹ پڑے گا، اور قیامت میں تم پر یہ بنے گی اور تم
لوگیوں جہنم کے ایندھن بنائے جاؤ گے۔ مگر ہم روزا انکار کرتے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں۔ نہ کوئی عذاب
آتا دکھائی دے رہا ہے اور نہ کوئی قیامت ہی ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ اسی کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

ان کو لمحہ بھر مہلت ہی مل سکے گی۔ مذاق تم سے پہلے بھی رسولوں کا اڑایا جا چکا ہے، مگر ان کا مذاق اڑانے والے اسی چیز کے پھیر میں آکر رہے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے یا

اے محمدؐ، ان سے کہو، کون ہے جو رات کو یادن کو تمہیں رحمان سے بچا سکتا ہو؟ مگر یہ اپنے رب کی نصیحت سے منہ موڑ رہے ہیں۔ کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید ان کو حاصل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے آباؤ اجداد کو ہم زندگی کا سرد سامان دیئے چلے گئے یہاں تک کہ ان کو دن لگ گئے۔ مگر کیا انہیں نظر نہیں آتا کہ ہم زمین کو مختلف سمتوں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں؟ پھر کیا یہ غالب آجائیں گے؟ ان سے کہہ دو کہ میں تو وحی کی بنا پر تمہیں متنبہ کر رہا

۱۳۳ یعنی اگر اچانک دن کو یارات کو کسی وقت خدا کا زبردست ہاتھ تم پر پڑ جائے تو آخر وہ کونسا زور آور حامی و ناصر ہے جو اس کی پکڑ سے تم کو بچالے گا؟

۱۳۴ یعنی ہماری اس مہربانی اور پرورش سے یہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں کہ یہ سب کچھ ان کا کوئی ذاتی اشتقاق ہے جس کا چھیننے والا کوئی نہیں۔ اپنی خوشحالیوں اور سرداریوں کو یہ لازوال سمجھنے لگے ہیں اور ایسے سرمست ہو گئے ہیں کہ انہیں کبھی یہ خیال تک نہیں آتا کہ لوہ پر کوئی خدا بھی ہے جو ان کی قسمتیں بنانے اور بگاڑنے کی قدرت رکھتا ہے۔

۱۳۵ یہ مضمون اس سے پہلے سورہ رعد میں گذر چکا ہے اور وہاں ہم اس کی تشریح بھی کر چکے ہیں (ملاحظہ فرمائیے تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۶۵-۲۶۶)۔ یہاں اس سیاق و سباق میں یہ ایک اور معنی بھی دے رہے ہیں۔ وہ یہ کہ زمین میں ہر طرف ایک غالب طائف کی کار فرمائی کے یہ آثار نظر آتے ہیں کہ اچانک کبھی ٹھٹھکی شکل میں کبھی وبا کی شکل میں کبھی سیلاب کی شکل میں کبھی زلزلے کی شکل میں، کبھی سردی یا گرمی کی شکل میں، اور کبھی کسی شکل میں، اور کبھی کسی اور شکل میں کوئی بلا ایسی آجاتی ہے جو انسان کے سب کیسے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی مرتے ہیں۔ بستیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ پہلہ پانی کھیتیاں غارت ہو جاتی ہیں۔ پیداوار گھٹ جاتی ہے۔ تجارتوں میں کساد بازاری آنے لگتی ہے۔ غرض انسان کے وسائل زندگی میں کبھی کسی طرف سے کمی

ہوں۔ مگر ہرے پکار کو نہیں سنا کرتے جبکہ انہیں خبردار کیا جائے۔ اور اگر تیرے رب کا عذاب ذرا سا انہیں چھو جائے تو اچھی پیچ اٹھیں کہ ہائے ہماری کم بختی، بے شک ہم خطاوار تھے۔

قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والے ترازو رکھ دیں گے، پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ جس کارائی کے واسطے برابر بھی کچھ کیا دھرا ہو گا وہ ہم سامنے لے آئیں گے۔ اور حساب لگانے کے لیے ہم کافی ہیں۔

پہلے ہم موسیٰ اور ہارون کو فرقان اور روشنی اور ذکر عطا کر چکے ہیں ان متقی لوگوں کی بھلائی

واقع ہو جاتی ہے اور کبھی کسی طرف سے۔ اور انسان اپنا سارا زور لگا کر بھی ان نقصانات کو نہیں روک سکتا۔

۱۵۷ یعنی جبکہ ان کے تمام وسائل زندگی ہمارے ہاتھ میں ہیں، جس چیز کو چاہیں گھٹادیں اور جسے چاہیں بڑکھائیں، تو کیا یہ اتنا بل بوتہ رکھتے ہیں کہ ہمارے مقابلے میں غالب آجائیں اور ہماری پکڑ سے بچ لگیں؟ کیا یہ آثار ان کو یہی اطمینان دلا دے ہیں کہ تمہاری طاقت لازوال اور تمہارا عیش غیر فانی ہے اور کوئی تمہیں پکڑنے والا نہیں ہے؟

۱۵۸ وہی عذاب جس کے لیے یہ جلدی مچاتے ہیں اور مذاق کے انداز میں کہتے ہیں کہ لاؤنا وہ عذاب، کیوں نہیں وہ ٹوٹ پڑتا۔

۱۵۹ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۹۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اس ترازو کی نوعیت کیا ہوگی۔ بہر حال وہ کوئی ایسی چیز ہوگی جو مادی چیزوں کو تولنے کے بجائے انسان کے اخلاقی اوصاف و اعمال اور اس کی نیکی و بدی کو تولے گی اور ٹھیک ٹھیک وزن کر کے بتا دیگی کہ اخلاقی حیثیت سے کس شخص کا کیا پایہ ہے۔ نیک ہے تو کتنا نیک ہے اور بد ہے تو کتنا بد۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ہماری زبان کے دوسرے الفاظ کو چھوڑ کر ترازو کا لفظ یا تو اس وجہ سے انتخاب فرمایا ہے کہ اس کی نوعیت ترازو سے مشابہ ہوگی، یا اس انتخاب کا مقصد یہ تصور دلانا ہے کہ جس طرح ایک ترازو کے پلڑے دو چیزوں کے وزن کا فرق ٹھیک ٹھیک بتا دیتے ہیں، اسی طرح ہماری میزان عدل بھی ہر انسان کے کا زنامہ زندگی کو چانچ کر کے کم و کاست بتا دے گی کہ اس میں نیکی کا پہلو غالب ہے یا بدی کا۔

۱۶۰ یہاں سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر شروع ہوتا ہے اور پے در پے بہت سے انبیاء کی زندگی کے واقعات

کے لیے جو بے دیکھے اپنے رب سے ڈریں اور جن کو (حساب کی) اس گھڑی کا کھٹکا لگا ہوا ہو۔ اور اب یہ بابرکت ذکر ہم نے تمہارے لیے، نازل کیا ہے۔ پھر کیا تم اس کو قبول کرنے سے انکاری ہو گے اُس سے بھی پہلے ہم نے ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی تھی اور ہم اُس کو خوب جانتے تھے۔

کی طرف مفصل یا مختصر اشارے کیے جاتے ہیں۔ یہ ذکر جس سیاق و سباق میں آیا ہے اُس پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حسب ذیل باتیں ذہن نشین کرنی مقصود ہیں:-

اول یہ کہ تمام پچھلے انبیاء بھی بشر ہی تھے، کوئی زوالی مخلوق نہ تھے۔ تاریخ میں یہ کوئی نیا واقعہ آج پہلی مرتبہ ہی پیش نہیں آیا ہے کہ ایک بشر کو رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔

دوم یہ کہ پہلے انبیاء بھی اسی کام کے لیے آئے تھے جو کام اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کر رہے ہیں۔ یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کی تعلیم تھی۔

سوم یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص معاملہ رہا ہے۔ بڑے بڑے مصائب سے وہ گزرے ہیں، سالہا سال مصائب میں مبتلا رہے ہیں، شخصی اور ذاتی مصائب میں بھی اور اپنے مخالفوں کے ڈالے ہوئے مصائب میں بھی، مگر آخر کار اللہ کی نصرت و تائید ان کو حاصل ہوئی ہے، اس نے اپنے فضل و رحمت سے ان کو نوازا ہے، ان کی دعاؤں کو قبول کیا ہے، ان کی تکلیفوں کو رفع کیا ہے، ان کے مخالفوں کو نیچا دکھایا ہے، اور معجزانہ طریقوں پر ان کی مدد کی ہے۔

چہارم یہ کہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مقبول بارگاہ ہونے کے باوجود، اور اس کی طرف سے بڑی بڑی حیرت انگیز حالتیں پانے کے باوجود تھے وہ بندے اور بشر ہی۔ الوہیت ان میں سے کسی کو حاصل نہ تھی۔ رائے اور قبیلے کی غلطی بھی کرتے تھے۔ بیمار بھی ہوتے تھے۔ آزمائشوں میں بھی ڈالے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ قصور بھی ان سے ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دے دی جاتی تھی۔

۵۔ تینوں الفاظ توراہ کی تعریف میں استعمال ہوئے ہیں، یعنی وہ حق و باطل کا فرق دکھانے والی کسوٹی تھی، وہ انسان کو زندگی کا سیدھا راستہ دکھانے والی روشنی تھی، اور وہ اولادِ آدم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے والی نصیحت تھی۔

یاد کرو وہ موقع جبکہ اُس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ ”یہ مورتن کسی ہیں جن کے تم لوگ

اٹھ یعنی اگر چہ بھی گئی تھی وہ تمام انسانوں کے لیے، مگر اس سے فائدہ عملاً وہی لوگ اٹھا سکتے تھے جو ان صفات سے منصف ہوں۔

۲۷ جس کا الہی اوپر ذکر گزرا ہے، یعنی قیامت۔

۲۸ ”ہوشمندی“ ہم نے ”رشد“ کا ترجمہ کیا ہے جس کے معنی ہیں ”صحیح و غلط میں تمیز کر کے صحیح بات یا طریقے کو اختیار کرنا اور غلط بات یا طریقے سے احتراز کرنا“ اس مفہوم کے لحاظ سے ”رشد“ کا ترجمہ ”راست روی“ بھی ہو سکتا ہے، لیکن چونکہ ”رشد“ کا لفظ محض راست روی کو نہیں بلکہ اُس راست روی کو ظاہر کرتا ہے جو نتیجہ ہونے پر صحیح اور عقل سلیم کا، اس لیے ہم نے ”ہوشمندی“ کے لفظ کو اُس کے مفہوم سے اقرب سمجھا ہے۔

”ابراہیم کو اس کی ہوشمندی بخشی“ یعنی جو ہوشمندی اس کو حاصل تھی وہ ہماری عطا کردہ تھی۔

”ہم اس کو خوب جانتے تھے“ یعنی ہماری یہ بخشش کوئی راندھی بانٹ نہ تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ کیسا آدمی ہے، اس لیے ہم نے اس کو نوازا۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَمِيَّتُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ، ”اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت

کس کے حوالے کرے“ (الانعام، رکوع ۱۵)۔ اس میں ایک لطیف اشارہ ہے مرداران قریش کے اُس اعتراض کی طرف جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آخر اس شخص میں کوئی نئے سرخاب کے پر لگے ہوئے

ہیں کہ اللہ ہم کو چھوڑ کر اسے رسالت کے منصب پر مقرر کرے۔ اس کا جواب مختلف مقامات پر قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے دیا گیا ہے۔ یہاں صرف اتنے لطیف اشارے پر اکتفا کیا گیا کہ یہی سوال ابراہیم کے

متعلق بھی ہو سکتا تھا، پوچھا جاسکتا تھا کہ سارے ملک عراق میں ایک ابراہیم ہی کیوں اس نعمت سے نوازا گیا، مگر ہم جانتے تھے کہ ابراہیم میں کیا اہمیت ہے، اس لیے اُن کی پوری قوم میں سے اُن کو اس نعمت کے لیے منتخب کیا گیا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت پاک کے مختلف پہلو اس سے پہلے سورہ بقرہ، انعام، توبہ، ہود، ابراہیم، حجر اور نخل میں گزرنے میں جن پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۴ - ۱۹۶ تا ۱۹۹ -

۲۰۱-۵۵۲ تا ۵۶۰ - جلد دوم، صفحہ ۲۲۲-۲۵۲ تا ۲۵۶ - ۲۸۸ تا ۲۹۱ - ۵۰۹ تا ۵۱۱ - ۵۸۰)

۲۹ جس واقعہ کا آگے ذکر کیا جا رہا ہے اُس کو پڑھنے سے پہلے یہ بات اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ قریش

گر ویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا "ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اس نے کہا "تم بھی گمراہ ہو اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا "کیا تمہارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے؟" اُس نے جواب دیا "نہیں، بلکہ فی الواقع تمہارا رب وہی ہے جو زمین اور آسمانوں کا رب اور اُن کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمہارے سامنے گواہی دیتا ہوں۔ اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا۔" چنانچہ اُس نے اُن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف اُن کے بڑے بت کو

کے لوگ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے، کعبہ انہی کا تعمیر کردہ تھا، سارے عرب میں کعبے کی مرکزیت انہی کی نسبت کے سبب سے تھی اور قریش کا سارا بھرم اسی لیے بندھا ہوا تھا کہ یہ اولاد ابراہیم ہیں اور کعبہ ابراہیمی کے مجاور ہیں۔ آج اس زمانے اور عرب سے دور دراز کے ماحول میں تو حضرت ابراہیم کا یہ قصہ صرف ایک سبق آموز تاریخی قصہ ہی نظر آتا ہے، مگر جس زمانے اور ماحول میں اول اول یہ بیان کیا گیا تھا، اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھیے تو محسوس ہو گا کہ قریش کے مذہب اور ان کی برہمنیت پر یہ ایک ایسی کاری ضرب تھی جو ٹھیک اُس کی جڑ پر جا کر گنتی تھی۔

۵۵۷ اس فقرے کا لفظی ترجمہ یہ ہو گا کہ "کیا تمہارے سامنے حق پیش کر رہا ہے یا کھبتا ہے۔" لیکن اصل مفہوم وہی ہے جس کی ترجمانی اوپر کی گئی ہے۔ اُن لوگوں کو اپنے دین کے برحق ہونے کا اتنا یقین تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ یہ باتیں کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ کر سکتا ہے۔ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تم مذاق اور کھیل کر رہے ہو یا واقعی تمہارے یہی خیالات ہیں۔

۵۵۸ یعنی اگر تم استدلال سے بات نہیں سمجھتے ہو تو میں عملاً تمہیں مشاہدہ کرادوں گا کہ یہ بے بس ہیں، ان کے پاس کچھ بھی اختیارات نہیں ہیں، اور ان کو خدا بنانا غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ عملی تجربے اور مشاہدے سے یہ بات وہ کس طرح ثابت کریں گے، تو اس کی کوئی تفصیل حضرت ابراہیم نے اُس موقع پر نہیں بتائی۔

۵۵۹ یعنی موقع پا کر جبکہ پجاری اور مجاور موجود نہ تھے، حضرت ابراہیم ان کے مرکزی بت خدانے میں گس گسے اور سارے بتوں کو توڑ ڈالا۔

چھوڑ دیا تاکہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔^{۵۵} انہوں نے آکر بتوں کا یہ حال دیکھا تو کہنے لگے یہ ہمارے خداؤں کا حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ۔ "بعض لوگ ابولے" ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔ انہوں نے کہا "تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تاکہ لوگ دیکھ لیں اس کی کیسی خبر لی جاتی ہے"۔^{۵۶} ابراہیم کے آنے پر، انہوں نے پوچھا "کیوں ابراہیم، تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟" اس نے جواب دیا "بلکہ یہ سب کچھ ان کے سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں۔" یہ سن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف

۵۵ "اس کی طرف" کا اشارہ بڑے بُت کی طرف بھی ہو سکتا ہے اور خود حضرت ابراہیم کی طرف بھی۔ اگر پہلی بات ہو تو یہ حضرت ابراہیم کی طرف سے ان کے عقائد پر ایک طنز کا ہم معنی ہے یعنی اگر ان کے نزدیک واقعی یہ خدا ہیں تو انہیں اپنے بڑے خدا کے متعلق یہ شبہ ہونا چاہیے کہ شاید بڑے حضرت ان چھوٹے حضرتوں سے کسی بات پر بگڑ گئے ہوں اور سب کا کچھ مرنبا ڈالا ہو۔ او اگر دوسرا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت ابراہیم کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری ہی طرف منتقل ہو گا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔

۵۶ یہ گویا حضرت ابراہیم کی منہ مانگی مراد تھی، کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ بات صرف پر دستوں اور پجاریوں ہی کے سامنے نہ ہو بلکہ عام لوگ بھی موجود ہوں اور سب دیکھ لیں کہ یہ بت جو ان کے قاضی الحاجات بنا کر رکھے گئے ہیں کیسے بے بس ہیں اور خود یہ پر دست حضرت ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ اس طرح ان پجاریوں سے بھی وہی حماقت سرزد ہوئی جو فرعون سے سرزد ہوئی تھی۔ اس نے بھی جادوگروں سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرنے کے لیے ملک بھر کی خلقت جمع کرائی تھی اور انہوں نے بھی حضرت ابراہیم کا مقدمہ سننے کے لیے عوام کو اکٹھا کر لیا۔ وہاں حضرت موسیٰ کو سب کے سامنے یہ ثابت کرنے کا موقع مل گیا کہ جو کچھ وہ لائے ہیں وہ جادو نہیں معجزہ ہے۔ اور یہاں حضرت ابراہیم کو ان کے دشمنوں نے آپ ہی یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ عوام کے سامنے ان کے مکر و فریب کا طلسم توڑ دیں۔

۵۷ یہ آخری فقرہ خود ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے فقرے میں حضرت ابراہیم نے بت شکنی کے اس فعل کو بڑے

بت کی طرف جو مسوب کیا ہے اس سے ان کا مقصد جھوٹ بولنا نہ تھا، بلکہ وہ اپنے مخالفین پر محبت قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی تھی کہ وہ لوگ جواب میں خود اس کا اقرار کریں کہ ان کے یہ معبود بالکل بے بس ہیں اور ان سے کسی فعل کی توقع تک نہیں کی جاسکتی ہے۔ ایسے مواقع پر ایک شخص استدلال کی خاطر جو خلاف واقعہ بات کہتا ہے اُس کو جھوٹ قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نہ وہ خود جھوٹ کی نیت سے ایسی بات کہتا ہے اور نہ اس کے مخاطب ہی اسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ کہنے والا اسے محبت قائم کرنے کے لیے کہتا ہے اور سننے والا بھی اُسے ایسی معنی میں لیتا ہے۔

بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم اپنی زندگی میں تین مرتبہ جھوٹ بولے ہیں۔ ان میں سے ایک جھوٹ "تو یہ ہے، اور دوسرا جھوٹ" سورہ صافات میں حضرت ابراہیم کا قول "اِنِّی سَبِّحُمْ" ہے، اور تیسرا جھوٹ "اُن کا اپنی بیوی کو بہن کہنا ہے جس کا ذکر قرآن میں نہیں بلکہ بائبل کی کتاب پیدائش میں آیا ہے۔ ایک گروہ روایت پرستی میں غلو کر کے اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے بخاری و مسلم کے چند راویوں کی صداقت زیادہ عزیز ہے اور اس بات کی پروا نہیں ہے کہ اس سے ایک نبی پر جھوٹ کا الزام عائد ہوتا ہے۔ دوسرا گروہ اس ایک روایت کو لے کر پورے ذخیرہ حدیث پر حملہ آور ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ساری ہی حدیثوں کو اٹھا کر بھینک دو کیونکہ ان میں ایسی روایتیں پائی جاتی ہیں۔ حالانکہ نہ ایک یا چند روایات میں کسی خرابی کے پائے جانے سے یہ لازم آتا ہے کہ ساری ہی روایات ناقابل اعتماد ہوں۔ اور نہ جن حدیث کے نقطہ نظر سے کسی روایت کی سند کا مضبوط ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اس کا متن خواہ کتنا ہی قابل اعتراض ہو مگر اسے ضرور آنکھیں بند کر کے مان لیا جائے۔ سند کے قوی اور قابل اعتماد ہونے کے باوجود بہت سے اسباب ایسے بہہ سکتے ہیں جن کی وجہ سے ایک متن غلط صورت میں نقل ہو جاتا ہے اور ایسے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے جن کی قباحت خود پکار رہی ہوتی ہے کہ یہ باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے سند کے ساتھ متن کو دیکھنا بھی ضروری ہے، اور اگر متن میں واقعی کوئی قباحت ہو تو پھر خواہ مخواہ اس کی صحت پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ حدیث، جس میں حضرت ابراہیم کے تین "جھوٹ" بیان کیے گئے ہیں، صرف اسی وجہ سے قابل اعتراض

پٹے اور اپنے دلوں میں، کہنے لگے "واقعی تم خود ہی ظالم ہو" مگر پھر اُن کی مت پٹ گئی اور بولے نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔ بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن تین واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔ اُن میں سے ایک "جھوٹ" کا حال بھی آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوئی معمولی عقل و خود کا آدمی بھی اس سیاق و سباق میں حضرت ابراہیم کے اس قول پر لفظ "جھوٹ" کا اطلاق نہیں کر سکتا، کجا کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاذ اللہ اس سخن ناشناسی کی توقع کریں۔ رہا اتنی سقیم والا واقعہ تو اس کا جھوٹ ہونا ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ حضرت ابراہیم فی الواقع اُس وقت بالکل صحیح و تندرست تھے اور کوئی ادنیٰ سی شکایت بھی اُن کو نہ تھی۔ یہ بات قرآن میں کہیں بیان ہوئی ہے اور نہ اس زبیر عیث روایت کے سوا کسی دوسری معتبر روایت میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اب رہ جاتا ہے بیوی کو بہن قرار دینے کا واقعہ، تو وہ بجائے خود ایسا مہمل ہے کہ ایک شخص اس کو سنتے ہی یہ کہہ دے گا کہ یہ ہرگز واقعہ نہیں ہو سکتا۔ قصہ اُس وقت کا بتایا جاتا ہے جب حضرت ابراہیم اپنی بیوی حضرت سارہ کے ساتھ مصر گئے ہیں۔ بائبل کی رو سے اُس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۷۵ اور حضرت سارہ کی عمر ۶۵ برس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ اور اس عمر میں حضرت ابراہیم کو یہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ شاہ مصر اس خوبصورت خاتون کو حاصل کرنے کی خاطر مجھے قتل کر دے گا۔ چنانچہ وہ بیوی سے کہتے ہیں کہ جیب مصری تمہیں پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے جانے لگیں تو تم بھی مجھے اپنا بھائی بتانا اور میں بھی تمہیں اپنی بہن بناؤں گا تاکہ میری جان تو بچ جائے (پیدائش، باب ۱۱۲)۔ حدیث کی زبیر عیث روایت میں تیسرے "جھوٹ" کی بنیاد اسی صریح لغو اور مہمل اسرائیلی روایت پر ہے۔ کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے پر صرف اس لیے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟ اسی طرح کی افراط پسندیاں پھر معاملے کو بگاڑ کر اُس تفریط تک نہایت پہنچا دیتی ہیں جس کا مظاہرہ منکرین حدیث کر رہے ہیں۔

۱۱۲ اصل میں نَكِسُوا عَلٰی رُؤْسِهِمْ رَاوَدَهَا دِيْنَةً كَسَتْ اُپنے سروں کے بل، فرمایا گیا ہے۔ بعض لوگوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ انہوں نے خجالت کے مارے سر جھکالیے۔ لیکن موقع و محل اور اسلوب بیان اس معنی کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ صحیح مطلب، جو سلسلہ کلام اور انداز کلام پر نظر کرنے سے صاف سمجھ میں

”تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں“ ابراہیم نے کہا ”پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمہیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان۔ تفسے تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟“ انہوں نے کہا ”جلاؤ لو اس کو اور حمایت کر دو اپنے خداؤں کی اگر تمہیں کچھ کرنا ہے“ ہم نے کہا ”اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر“ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا۔

آجاتا ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کا جواب سنتے ہی پہلے تو انہوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ واقعی ظالم تو تم خود ہو، کیسے بے بس اور بے اختیار معبودوں کو خدا بنائے بیٹھے ہو جو اپنی زبان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان پر کیا میتی اور کون انہیں مار گسیا؟ آخر یہ ہماری کیا مدد کریں گے جب کہ خود اپنے آپ کو بھی نہیں بچا سکتے۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی ان پر خدا اور جہالت سوار ہو گئی اور جیسا کہ ضد کا خاصہ ہے، اس کے سوار ہوتے ہی ان کی عقل اوندھ گئی۔ داغ سیدھا سوچتے سوچتے بکا یک اٹا سوچنے لگا۔

۱۔ الفاظ صاف بتا رہے ہیں، اور سیاق و سباق بھی اس مفہوم کی تائید کر رہا ہے، کہ انہوں نے واقعی اپنے اس فیصلے پر عمل کیا، اور جب آگ کا الاؤ تیار کر کے انہوں نے حضرت ابراہیم کو اس میں پھینکا تب اللہ تعالیٰ نے آگ کو حکم دیا کہ وہ ابراہیم کے بیسے ٹھنڈی ہو جائے اور بے حذر بن کر رہ جائے۔ پس صریح طور پر یہ بھی ان معجزات میں سے ایک ہے جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان معجزات کی اس لیے تاویلیں کرتا ہے کہ اس کے نزدیک خدا کے لیے بھی نظام عالم کے معمول (ROUTINE) سے ہٹ کر کوئی غیر معمولی کام کرنا ممکن نہیں ہے، تو آخر وہ خدا کو ماننے ہی کی زحمت کیوں اٹھاتا ہے۔ اور اگر اس طرح کی تاویلیں وہ اس لیے کرتا ہے کہ جدید زلمنے کے نام نہاد عقلیت پرست ایسی باتوں کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تو ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ بعد خدا، تیرے اوپر یہ فرض کس نے عائد کیا تھا کہ تو کسی نہ کسی طرح انہیں منوا کر ہی چھوڑے؟ جو شخص قرآن کو، جیسا کہ وہ ہے، ماننے کے لیے تیار نہیں ہے، اسے اس کے حال پر چھوڑو۔ اسے منوانے کی خاطر قرآن کو اس کے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا، جبکہ قرآن کے الفاظ قدم قدم پر اس ڈھلائی کی مزاحمت کر رہے ہوں، آخر کس قسم کی تبلیغ ہے اور کون معقول آدمی اسے جائز سمجھ سکتا ہے۔

اور ہم اُسے اور لوط کو بچا کر اُس سرزمین کی طرف نکالنے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔ اور ہم نے اسے اسحق عطا کیا اور یعقوب اس پر مزید، اور سب کو صالح بنایا۔ اور ہم نے ان کو امام بنا دیا جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔ اور ہم نے انہیں وحی کے ذریعہ نیک کاموں کی اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کی ہدایت کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

۶۳ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم کے دو بھائی تھے، نحر اور حاران۔ حضرت لوط حاران کے بیٹے تھے (پیدائش باب ۱۱، آیت ۲۶)۔ سورہ عنکبوت میں حضرت ابراہیم کا جو تذکرہ آیا ہے اُس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قوم میں سے صرف ایک حضرت لوط ہی ان پر ایمان لائے تھے (ملاحظہ ہو رکوع ۱۳)۔ یعنی شام و فلسطین کی سرزمین۔ اس کی برکتیں مادی بھی ہیں اور روحانی بھی۔ مادی حیثیت سے وہ دنیا کے نزدیک ترین علاقوں میں سے ہے۔ اور روحانی حیثیت سے وہ ہزار برس تک انبیاءِ عظیم السلام کا مہبط ہی ہے۔ دنیا کے کسی دوسرے خطے میں اتنی کثرت سے انبیاء مبعوث نہیں ہوئے ہیں۔

۶۴ یعنی بیٹے کے بعد پوتا بھی ایسا ہوا جسے نبوت سے سرفراز کیا گیا۔

۶۵ حضرت ابراہیم کی زندگی کے اس اہم واقعے کا بائبل میں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ ان کی زندگی کے عراقی دور کا کوئی واقعہ بھی اس کتاب میں جگہ نہیں پاسکا ہے۔ فرد سے ان کی ٹڈ بھڑ، باپ اور قوم سے ان کی کشمکش، بت پرستی کے خلاف ان کی جدوجہد، آگ میں ڈالے جانے کا قصہ، اور بالآخر ملک چھوڑنے پر مجبور ہونا، ان میں سے ہر چیز بائبل کی کتاب "پیدائش" کے مصنف کی نگاہ میں ناقابلِ اہمیت تھی۔ وہ صرف ان کی ہجرت کا ذکر کرتا ہے، مگر وہ بھی اس انداز سے کہ جیسے ایک خاندان تلاشِ معاش میں ایک ملک چھوڑ کر دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو رہا ہے۔ قرآن اور بائبل کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ اختلاف یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی رو سے حضرت ابراہیم کا مشرک باپ ان پر ظلم کرنے میں پیش پیش تھا، اور بائبل کہتی ہے کہ ان کا باپ خود اپنے بیٹوں، پوتوں اور بہوؤں کے ساتھ حاران میں جا بسا (باب ۱۱- آیات ۲۴ تا ۳۲)۔ اس کے بعد ایک خدا حضرت ابراہیم سے کہتا ہے کہ تو حاملن کو چھوڑ کر کنعان میں جا کر بس جا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا، سو تو باعثِ برکت ہو، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت

کرے اُس پر میں لعنت کرونگا اور زمین کے سب قبیلے تیرے ویسے سے برکت پائیں گے" (آیت ۱۲ تا ۱۳)۔
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اچانک حضرت ابراہیم پر یہ نظر عنایت کیوں ہو گئی۔

تلمود میں البتہ سیرت ابراہیمی کے عراتی و ذر کی وہ بیشتر تفصیلات ملتی ہیں جو قرآن کے مختلف مقامات پر بیان ہوئی ہیں، مگر دونوں کا تقابل کرنے سے نہ صرف یہ کہ قصے کے اہم اجزاء میں بین تفاوت نظر آتا ہے بلکہ ایک شخص صریح طور پر یہ محسوس کر سکتا ہے کہ تلمود کا بیان بکثرت بے جوڑ اور خلاف قیاس باتوں سے بھرا ہوا ہے اور اس کے برعکس قرآن بالکل منقح صورت میں حضرت ابراہیم کے اہم واقعات زندگی کو پیش کرتا ہے جن میں کوئی لغو بات آئے نہیں پائی ہے۔ تشریح مدعا کے لیے ہم یہاں تلمود کی داستان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں تاکہ اُن لوگوں کی غلطی پوری طرح کھل جائے جو قرآن کو بائبل اور یہودی لٹریچر کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔

تلمود کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش کے روز نجر میں نے آسمان پر ایک علامت دیکھ کر فرود کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تارح کے ہاں جو بچہ پیدا ہوا ہے اُسے قتل کر دے۔ چنانچہ وہ اُن کے قتل کے درپے ہوا۔ مگر تارح نے اپنے ایک غلام کا بچہ ان کے بدلے میں دے کر انہیں بچا لیا۔ اس کے بعد تارح نے اپنی بیوی اور بچے کو ایک غار میں لے جا کر چھپا دیا جہاں ۱۰ سال تک وہ رہے۔ گیارہویں سال حضرت ابراہیم کو تارح نے حضرت نوح کے پاس پہنچا دیا اور ۳۹ سال تک وہ حضرت نوح اور ان کے بیٹے سام کی تربیت میں رہے۔ اسی زمانے میں حضرت ابراہیم نے اپنی سگی بھتیجی سارہ سے نکاح کر لیا جو عمر میں ان سے ۲۲ سال چھوٹی تھیں۔ بائبل اس کی تصریح نہیں کرتی کہ سارہ حضرت ابراہیم کی بھتیجی تھیں۔ نیز وہ دونوں کے درمیان عمر کا فرق بھی صرف ۱۰ سال بتاتی ہے۔ پیدائش باب ۱۱-آیت ۲۹- اور باب ۱۴-آیت ۱۴)

پھر تلمود کہتی ہے کہ حضرت ابراہیم پچاس سال کی عمر میں حضرت نوح کا گھر چھوڑ کر اپنے باپ کے ہاں آگئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ باپ بت پرست ہے اور گھر میں سال کے بارہ مہینوں کے حساب سے ۱۲ بت رکھے ہیں۔ انہوں نے پہلے تو باپ کو سمجھانے کی کوشش کی، اور جب اس کی سمجھ میں بات نہ آئی تو ایک روز موقع پا کر اس گھر کو بت ختنے کو توڑ ڈالا۔ تارح نے آکر اپنے خداؤں کا یہ حال جو دیکھا تو سیدھا فرود کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ ۵ برس پہلے میرے ہاں جوڑ کا پیدا ہوا تھا آج اس نے میرے گھر میں یہ حرکت کی ہے،

آپ اس کا فیصلہ کیجیے۔ فرود نے بلا کر حضرت ابراہیم سے باز پرس کی۔ انہوں نے سخت جوابات دیئے۔ فرود نے اُن کو تو فوراً جیل بھیج دیا اور پھر معاملہ اپنی کوشل میں پیش کیا تاکہ صلاح مشورے سے اس مقدمے کا فیصلہ کیا جائے۔ کوشل کے ارکان نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ آگ کا ایک بڑا لاٹ تیار کر دیا گیا اور حضرت ابراہیم اس میں پھینک دیے گئے۔ حضرت ابراہیم کے ساتھ ان کے بھائی اور شمر، حاران کو بھی پھینکا گیا، کیونکہ فرود نے تارح سے جب پوچھا کہ تیرے اس بیٹے کو تو میں پیدائش ہی کے روز قتل کرنا چاہتا تھا، تو نے اُس وقت اسے بچا کر دو سرا بچہ کیوں اس کے بدلے قتل کر لیا، تو اس نے کہا کہ میں نے حاران کے کہنے سے یہ حرکت کی تھی۔ اس لیے خود اس فعل کے ترکب کو تو چھوڑ دیا گیا اور مشورہ دینے والے کو حضرت ابراہیم کے ساتھ آگ میں پھینکا گیا۔ آگ میں گرتے ہی حاران فوراً جل لہن کر کوئلہ ہو گیا مگر حضرت ابراہیم کو لوگوں نے دیکھا کہ اندر اطمینان سے ٹہل رہے ہیں۔ فرود کو اس معاملے کی اطلاع کی گئی۔ اس نے آکر جب خود اپنی آنکھوں سے یہ ماجرا دیکھ لیا تو پکار کر کہا کہ "آسمانی خدا کے بندے، آگ سے نکل آ اور میرے سامنے کھڑا ہو جا" حضرت ابراہیم باہر آگئے۔ فرود ان کا معتقد ہو گیا اور اس نے بہت سے قیمتی نذرانے ان کو دے کر رخصت کر دیا۔

اس کے بعد تمہود کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم دو سال تک وہاں رہے۔ پھر فرود نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا اور اس کے نجومیوں نے اس کی تعبیر یہ بتائی کہ ابراہیم تیری سلطنت کی تباہی کا موجب بنے گا، اسے قتل کرادے۔ اُس نے قتل کے لیے آدمی بھیجے، مگر حضرت ابراہیم کو خود فرود ہی کے عطیے ہوئے ایک غلام، البعز نے قبل از وقت اس منصوبے کی اطلاع دے دی اور حضرت ابراہیم نے بھاگ کر حضرت نوح کے ہاں پناہ لی۔ وہاں تارح آکر اُن سے خفیہ طور پر متا رہا اور آخر باپ بیٹوں کی یہ صلاح ہوئی کہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ حضرت نوح اور سام نے بھی اس تجویز کو پسند کیا۔ چنانچہ تارح اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور پوتی اور بہو سارہ کو لے کر اُس سے حاران چلا گیا۔ دستخطات تمہود۔ از اریح پولانو، لندن صفحہ ۳۰ تا ۳۲

کیا اس داستان کو دیکھ کر کوئی معقول آدمی یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ قرآن کا ماخذ ہو سکتی ہے؟

اور لوط کو ہم نے حکم اور علم بخشا اور اُسے اُس نسبتی سے بچا کر نکال دیا جو بد کاریاں کرتی تھی۔
درحقیقت وہ بڑی ہی بُری، فاسق قوم تھی۔ اور لوط کو ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا، وہ
صالح لوگوں میں سے نہایع

اور یہی نعمت ہم نے نوح کو دی۔ یاد کرو جبکہ ان سب سے پہلے اُس نے ہمیں پکارا تھا۔
ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے اور اس کے گھر والوں کو کربِ عظیم سے نجات دی اور
اُس قوم کے مقابلے میں اُس کی مدد کی جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔ وہ بڑے بڑے لوگ
تھے۔ پس ہم نے ان سب کو غرق کر دیا۔

اور اسی نعمت سے ہم نے داؤد و سلیمان کو سرفراز کیا۔ یاد کرو وہ موقع جبکہ وہ دونوں ایک
کھیت کے مقدمے میں فیصلہ کر رہے تھے جس میں رات کے وقت دوسرے لوگوں کی بکریاں
پھیل گئی تھیں، اور ہم اُن کی عدالت کو خود دیکھ رہے تھے۔ اُس وقت ہم نے صحیح فیصلہ سلیمان کو
سمجھا دیا، حالانکہ حکم اور علم ہم نے دونوں ہی کو عطا کیا تھا۔

۶۷ حکم اور علم بخشا۔ بالعموم قرآن مجید میں نبوت عطا کرنے کا ہم معنی ہوتا ہے۔ "حکم" سے مراد حکمت بھی
ہے، صحیح قربت فیصلہ بھی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سند حکمرانی (AUTHORITY) حاصل ہونا بھی۔ "ہما علم"
تو اس سے مراد وہ علم حق ہے جو وحی کے ذریعہ عطا کیا گیا ہو۔ حضرت لوط کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے

ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد ۲ - صفحہ ۵۱ تا ۵۳ - ۲۱۲ - ۲۵۵ تا ۲۵۹ - ۳۶۲ - ۲۸۹ - ۵۱۱ تا ۵۱۵ -

۶۸ اشارہ ہے حضرت نوح کی اس دعا کی طرف جو ایک مدت دراز تک اپنی قوم کی اصلاح کے لیے ناکام کوششیں
کرتے رہنے کے بعد آخر کار تھا کہ انہوں نے مانگی تھی کہ اِنِّی مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ، "پروردگار میں مغلوب ہو گیا ہوں
اب میری مدد کر پیغمبر" (القمر - رکوع ۱)۔ اور دَبِّ لَاقْتَدِرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنْ اَلْکٰفِرِیْنَ دَبَّارًا، "پروردگار زمین
پر ایک کافر باشندہ بھی نہ چھوڑ" (نوح - رکوع ۲)

۶۹ رب عظیم سے مراد یا تو ایک بد کردار قوم کے درمیان زندگی بسر کرنے کی مصیبت ہے، یا پھر طوفان۔
حضرت نوح کے قصے کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم صفحہ ۲۰ تا ۲۲ - ۲۹۹ - ۳۰۱ تا ۳۰۳ - ۳۲۳ تا ۳۲۵ -

تھے اس واقعے کا کوئی ذکر بائبل میں نہیں ہے، اور یہودی ٹریجر میں بھی نہیں اس کا کوئی نشان نہیں ملا۔ مسلمان مفسرین نے اس کی جو تشریح کی ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے کھیت میں دوسرے شخص کی بکریاں رات کے وقت گھس گئی تھیں۔ اُس نے حضرت داؤد کے ہاں استغاثہ کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اُس کی بکریاں چھین کر اسے دے دی جائیں۔ حضرت سلیمان نے اس سے اختلاف کیا اور یہ رائے دی کہ بکریاں اُس وقت تک کھیت والے کے پاس رہیں جب تک بکری والا اُس کے کھیت کو پھر سے تیار نہ کر دے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ یہ فیصلہ ہم نے سلیمان کو سنجھایا تھا۔ مگر چونکہ مقدمے کی یہ تفصیل قرآن میں بیان نہیں ہوئی ہے اور نہ کسی حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تصریح نقل ہوئی ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کے مقدمے میں یہی بات ثابت شدہ اسلامی قانون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور دوسرے فقہائے اسلام کے درمیان اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اگر کسی کا کھیت دوسرے شخص کے جانور خراب کر دیں تو کوئی تاوان عائد ہوگا یا نہیں اور عائد ہوگا تو کس صورت میں ہوگا، نیز یہ کہ تاوان کی شکل کیا ہوگی۔

اس سبق و سابق میں حضرت داؤد و سلیمان کے اس خاص واقعے کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ انبیاء علیہم السلام نبی ہونے اور اللہ کی طرف سے غیر معمولی طاقتیں اور تابلیتیں پانے کے باوجود ہوتے انسان ہی تھے، الوہیت کا کوئی شائبہ ان میں نہ ہوتا تھا۔ اس مقدمے میں حضرت داؤد کی رہنمائی وحی کے ذریعہ سے نہ کی گئی اور وہ فیصلہ کرنے میں غلطی کر گئے۔ حضرت سلیمان کی رہنمائی کی گئی اور انہوں نے صحیح فیصلہ کیا۔ حالانکہ نبی دونوں ہی تھے۔ آگے ان دونوں بزرگوں کے جن کمالات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی یہی بات سمجھانے کے لیے ہے کہ یہ عطائی کمالات تھے اور اس طرح کے کمالات کسی کو خدا نہیں بنا دیتے۔ ضمناً اس آیت سے عدالت کا یہ اصول بھی معلوم ہوا کہ اگر دونوں ایک مقدمے کا فیصلہ کریں، اور دونوں کے فیصلے مختلف ہوں، تو اگرچہ صحیح فیصلہ ایک ہی کا ہوگا، لیکن دونوں برحق ہونگے، بشرطیکہ عدالت کرنے کی ضروری استعداد دونوں میں موجود ہو، ان میں سے کوئی جہالت اور ناتجربہ کاری کے ساتھ عدالت کرنے نہ بیٹھ جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اس بات کو اور زیادہ کھول کر

داؤد کے ساتھ ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو تسبیح کرتے تھے، اس فعل کے کرنے والے ہم ہی تھے۔ اور ہم نے اُس کو تمہارے فائدے کے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی

بیان فرمادیا ہے۔ بخاری میں عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا اذا اجتهد الحاكم فاصاب فله اجران واذا اجتهد فاحطاً فله اجرٌ۔ اگر حاکم اپنی حد تک حق فیصلہ کرنے کی پوری کوشش کرے تو صحیح فیصلہ کرنے کی صورت میں اُس کے لیے دُہرا اجر ہے اور غلط فیصلہ کرنے کی صورت میں اکہرا اجر۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ میں بڑیدہ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا قاضی تین قسم کے ہیں، ایک ان میں سے جنتی ہے اور دوسری جہنمی۔ جنتی وہ قاضی ہے جو حق کو پہچان جائے تو اس کے مطابق فیصلہ دے۔ مگر جو شخص حق کو پہچانتے کے باوجود غلاب حق فیصلہ دے تو وہ جہنمی ہے۔ اور اسی طرح وہ بھی جہنمی ہے جو علم کے بغیر لوگوں کے فیصلے کرنے کے لیے میٹھ جائے۔

اِنَّ مَعَ دَاوُدَ كَافَّةً مِنَ الطَّيْرِ، لِيَا دَاوُدَ كَافَّةً مِنَ الطَّيْرِ، یعنی ”داؤد علیہ السلام کے لیے نہیں بلکہ ان کے ساتھ“ پہاڑ اور پرندے مسخر کیے گئے تھے، اور اس تسخیر کا حاصل یہ تھا کہ وہ بھی حضرت ممدوح کے ساتھ اللہ کی تسبیح کرتے تھے۔ یہی بات سورہ ص میں بیان کی گئی ہے، اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحُنَّ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً كُلٌّ لَّهُ أَوَايٌ، ”ہم نے اُس کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کر دیا تھا کہ صبح و شام تسبیح کرتے تھے، اور پرندے بھی مسخر کر دیے تھے جو اکٹھے ہو جاتے تھے، سب اُس کی تسبیح دہراتے تھے“ سورہ سبأ میں اس کی مزید وضاحت یہ مٹی ہے يَا جِبَالُ اُدْبِي مَعَهُ وَالطَّيْرُ، ”پہاڑوں کو ہم نے حکم دیا کہ اُس کے ساتھ تسبیح دہراؤ، اور یہی حکم پرندوں کو دیا“ ان ارشادات سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد جب اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گاتے تھے تو ان کی بلند اور سرلی آواز سے پہاڑ گونج اٹھتے تھے، پرندے ٹھیر جاتے تھے اور ایک سماں بندھ جاتا تھا۔ اس معنی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جس میں ذکر آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو موسیٰ اشعریٰ جو غیر معمولی طور پر خوش آواز بزرگ تھے، قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے تو ان کی آواز سن کر کھڑے ہو گئے اور دیر تک سنتے رہے۔ جب وہ ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا لفتل اوتی من ماراً من مزامیرال داؤد، یعنی اس شخص

تھی، تاکہ تم کو ایک دوسرے کی مار سے بچائے، پھر کیا تم شکر گزار ہو؟ اور سلیمان کے لیے ہم نے کو داؤد کی خوش آوازی کا ایک حصہ ملا ہے۔

۱۷ سورہ سبأ میں مزید تفصیل یہ ہے: **وَأَنزَلْنَا لَهُ الْحَدِيدَ إِذِ انْعَمَلْ سَبْعِينَ وَاقْتِدَارِي السُّدِّ** وہ اور ہم نے لوہے کو اس کے لیے نرم کر دیا اور اس کو ہدایت کی، کہ پوری پوری زر میں بنا اور ٹھیک انداز سے کڑیاں جوڑے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو لوہے کے استعمال پر قدرت عطا کی تھی، اور خاص طور پر جنگی اغراض کے لیے زرہ سازی کا طریقہ سکھایا تھا۔ موجودہ زمانے کی تاریخی و اثری تحقیقات سے ان آیات کے معنی پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں لوہے کے استعمال کا دور (IRON AGE)

۱۸ سورہ ق م کے درمیان شروع ہوا ہے، اور یہی حضرت داؤد کا زمانہ ہے۔ اول اول شام اور ایشیا کے لوہے کی جتنی قوم (Hittites) کو لوہے کے پھلانے اور تیار کرنے کا ایک پھیلنے والا طریقہ معلوم ہوا اور وہ شدت کے ساتھ اس کو دنیا بھر سے راز میں رکھے رہی۔ مگر اس طریقے سے جو لوہا تیار ہوتا تھا وہ سونے چاندی کی طرح اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ عام استعمال میں نہ آسکتا تھا۔ بعد میں فلسطینیوں نے یہ طریقہ معلوم کر لیا، اور وہ بھی اسے راز میں رکھتے رہے۔ طاوت کی بادشاہی سے پہلے فلسطینیوں اور فلسطینیوں نے بنی اسرائیل کو پیہم شکستیں دے کر جس طرح فلسطین سے بے دخل کر دیا تھا، بائبل کے بیان کے مطابق اس کے وجوہ میں سے ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ یہ لوگ لوہے کی رتھیں استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس دوسرے آہنی ہتھیار بھی تھے (شروع باب ۱۷- آیت ۱۶- قضاة باب ۱- آیت ۱۹- باب ۴- آیت ۲-۳)۔ سورہ ق م میں جب طاوت خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کا فرمانروا بنا تو اس نے پیہم شکستیں دے کر ان لوگوں سے فلسطین کا برا حصہ واپس لے لیا، اور پھر حضرت داؤد نے (۹۶۵ ق م) نے نہ صرف فلسطین و شرق اردن، بلکہ شام کے بھی بڑے حصے پر اسرائیلی سلطنت قائم کر دی۔ اس زمانہ میں آہن سازی کا وہ راز جو فلسطینیوں اور فلسطینیوں کے قبضے میں تھا، بے نقاب ہو گیا، اور صرف بے نقاب ہی نہ ہوا بلکہ آہن سازی کے ایسے طریقے بھی نکل آئے جن سے عام استعمال کے لیے لوہے کی سستی چیزیں تیار ہونے لگیں، فلسطین کے جنوب میں اڈوم کا علاقہ خام لوہے (IRON ORE)

تیر ہوا کو مسخر کر دیا تھا جو اس کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں، ہم ہر چیز کا علم رکھنے والے تھے۔ اور شیاطین میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو

کی دولت سے بالامال ہے، اور حال میں آثارِ قدیمہ کی جو کھدائیاں اس علاقے میں ہوئی ہیں، ان میں بکثرت ایسی جگہوں کے آثار ملے ہیں جہاں لوہا پگھلانے کی بھٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ عقابہ (ایلہ) سے متصل حضرت سلیمان کے زمانے کی بندرگاہ۔ عصفیون جابر کے آثارِ قدیمہ میں جو بھٹی ملی ہے اس کے معاملے سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس میں بعض وہ اصول استعمال کیے جاتے تھے جو آج جدید ترین زمانے کی (BLAST

FURNACES) میں استعمال ہوتے ہیں۔ اب یہ ایک قدرتی بات ہے کہ حضرت داؤد نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس جدید دریافت کو جنگی اغراض کے لیے استعمال کیا ہوگا، کیونکہ تھوڑی ہی مدت پہلے اُس پاس کی دشمن قوموں نے اسی لوہے کے ہتھیاروں سے اُن کی قوم پر عرصہ حیات تک کر دیا تھا۔

۱۷۳ حضرت داؤد کے متعلق مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول ص ۱۹۱۔ جلد دوم ص ۵۹۷-۶۲۲۔

۱۷۴ اس کی تفصیل سورہ سبا میں یہ آئی ہے: **وَلَيْسَ مِنَ التَّوْحِيدِ عُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَّاحُهَا شَهْرٌ** اور سلیمان کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا تھا، ایک چینی کی راہ تک اس کا چلنا صبح کو اور ایک چینی کی راہ تک اُس کا چلنا شام کو۔ پھر اس کی مزید تفصیل سورہ ص میں یہ آئی ہے: **فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رِجْحًا حَيْثُ أَصَابَ** پس ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے سہولت چلتی تھی جہاں وہ جانا چاہتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا کو حضرت سلیمان کے لیے اس طرح تابع امر کر دیا گیا تھا کہ ان کی مملکت سے ایک چینی کی راہ تک کے مقامات کا سفر سہولت کیا جاسکتا تھا۔ جانے میں بھی ہمیشہ ان کی مرضی کے مطابق بادِ موائف ملتی تھی اور واپسی پر بھی۔ بائبل اور جدید تاریخی تحقیقات سے اس مضمون پر جو روشنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت سلیمان نے اپنے دورِ سلطنت میں بہت بڑے پیمانے پر بحری تجارت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک طرف عصفیون جابر سے ان کے تجارتی جہاز بحرِ اعراب میں اود دوسرے سینوبی و مشرقی ممالک کی طرف جاتے تھے۔ اور دوسری طرف بحرِ روم کے بندرگاہوں سے ان کا

اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔ اُن سب کے نگراں ہم ہی تھے۔

پٹرہ (جسے بائبل میں "ترسیسی پٹرہ" کہا گیا ہے) مغربی مالک کی طرف جایا کرتا تھا۔ حبیبون جاہر میں ان کے زمانے کی جو عظیم الشان بھٹی ملی ہے اس کے مقابلے کی کوئی بھٹی مغربی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں ابھی تک نہیں ملی۔ آثار قدیمہ کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہاں اُدوم کے علاقہ عَرَب کی کانوں سے خام لوہا اور تانبا لایا جاتا تھا اور اس بھٹی میں گچھلا کر اسے دوسرے کاموں کے علاوہ جہاز سازی میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے قرآن مجید کی اُس آیت کے مفہوم پر روشنی پڑتی ہے جو سورہ سبا میں حضرت سلیمان کے متعلق آئی ہے کہ **وَاسْتَدْنَا لَهُ عَيْنَ الْقِطْرِ** اور ہم نے اس کے لیے گچھلی ہوئی دھات کا چشمہ بہا دیا۔" نیز اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں رکھنے سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت سلیمان کے لیے ایک مہینے کی رات تک ہوا کی رفتار کو مسخر کرنے کا کیا مطلب ہے۔ اُس زمانے میں بحری سفر کا سارا انحصار بادِ موافق ملنے پر تھا، اور اللہ تعالیٰ کا حضرت سلیمان پر یہ کرم خاص تھا کہ وہ ہمیشہ اُن کے دونوں بحری بیٹروں کو اُن کی مرضی کے مطابق ملتی تھی۔ تاہم اگر ہوا پر حضرت سلیمان کو حکم چلانے کا بھی کوئی اقتدار دیا گیا ہو، جیسا کہ **تَجْرِي بِأَحْرَابٍ** اس کے حکم سے چلتی تھی، کے ظاہر الفاظ سے مترشح ہونا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بعید نہیں ہے۔ وہ اپنی مملکت کا آپ مالک ہے۔ اپنے جس بندے کو جو اختیارات چاہے دے سکتا ہے جب وہ خود کسی کو کوئی اختیار دے تو ہمارا دل دکنے کی کوئی وجہ نہیں۔

سورہ سبا میں اس کی تفصیل یہ آئی ہے: **وَمِنَ الْجِبِّ مَن يَعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِإِذْنِ رَبِّهِ، وَمَنْ يَبْزُغْ مِنْهُمْ عَنْ مَضْرُوبِ نَذْرِهِ مِنْ عَذَابِ السَّعِيرِ۔ يَعْملُونَ لَهُ مَا يَشَاءُونَ مِنْ مَّحَارِبٍ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَاسِيَاتٍ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَى مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهُ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّتِ الْجِبُّ أَنَّ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوا فِي الْعَذَابِ الْمُهِينِ** اور جنوں میں سے ایسے جن ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیے تھے جو اس کے رب کے حکم سے اُس کے آگے کام کرتے تھے اور جو ہمارے حکم سے کوئی ان میں سے انحراف کرتا تو ہم اس کو بھڑکتی ہوئی آگ کا مڑا چھپانے۔ وہ اُس کے لیے جیسے وہ چاہتا تھا اور محبتے اور حوض جیسے بڑے بڑے لگن اور بھاری جہی ہوئی دیکھیں بناتے تھے پھر

اور یہی (ہوشمندی اور حکم و علم کی نعمت) ہم نے ایوبؑ کو دی تھی۔ یاد کرو جبکہ اس نے اپنے رب
 جب ہم نے سیماں کو وفات دے دی تو ان جنوں کو اس کی موت پر مطلع کرنے والی کوئی چیز نہ تھی مگر زمین کا کھرا
 (یعنی گھن) جو ان کے عصا کو کھار یا تھا۔ پس جب وہ گر پڑا تو جنوں کو پتہ چل گیا کہ اگر وہ واقعی غیب داں ہوتے تو
 اس ذلت کے عذاب میں اتنی مدت تک مبتلا نہ رہتے۔ اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ
 جو شیاطین حضرت سیماں کے بیسے مستخر ہوئے تھے، اور جو ان کے لیے مختلف خدمات انجام دیتے تھے، وہ جن تھے،
 اور جن بھی وہ جن بن کے بارے میں مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا، اور جو خود اپنے بارے میں بھی یہ غلط فہمی رکھتے
 تھے کہ ان کو علم غیب حاصل ہے۔ اب ہر شخص جو قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر پڑھے، اور اس کو اپنے نقیبات اور
 پیشگی قائم کیے ہوئے نظریات کا تابع بنائے بغیر پڑھے، یہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جہاں قرآن مطلقاً "شیطان" اور
 "جن" کے الفاظ استعمال کرتا ہے وہاں اس کی مراد کوئی مخلوق ہوتی ہے، اور قرآن کی رو سے وہ کون سے جن ہیں جن کو
 مشرکین عرب عالم الغیب سمجھتے تھے۔

جدید زمانے کے مفسرین یہ ثابت کرنے کے لیے ایٹری چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں کہ وہ جن اور شیاطین جو حضرت
 سیماں کے لیے مسخر کیے گئے تھے، انسان تھے اور اس پاس کی قوموں میں سے فراہم ہوئے تھے۔ لیکن صرف یہی نہیں
 کہ قرآن کے الفاظ میں ان کی اس تاویل کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ قرآن میں جہاں جہاں بھی یہ قصہ آیا ہے
 وہاں کا سیاق و سباق اور انداز بیان اس تاویل کو راہ دینے سے صاف انکار کرتا ہے۔ حضرت سیماں کے لیے
 عمارتیں بنانے والے اگر انسان ہی تھے تو آخر یہ انہی کی کوئی خصوصیت تھی جس کو اس شان سے قرآن مجید میں بیان
 کیا گیا ہے۔ ابراہم مصری سے لے کر نبویارک کی نلک شکاف عمارتوں تک کس چیز کو انسانوں نے نہیں بنایا ہے اور
 کس بادشاہ یا رئیس یا ملک التجار کے لیے وہ جن "اور شیاطین" فراہم نہیں ہوئے جو آپ حضرت سیماں کے
 لیے فراہم کردہ ہیں؟

۱۷۵ حضرت ایوب کی شخصیت، زمانہ، قومیت، ہر چیز کے بارے میں اختلاف ہے۔ جدید زمانے کے
 محققین میں سے کوئی ان کو اسرائیلی قرار دیتا ہے، کوئی مصری اور کوئی عرب۔ کسی کے نزدیک ان کا زمانہ حضرت
 موسیٰ سے پہلے کا ہے، کوئی انہیں حضرت داؤد و سیماں کے زمانے کا آدمی قرار دیتا ہے، اور کوئی ان سے بھی متاخر

کو لپکارا کہ مجھے بیماری لگ گئی ہے اور تو رحم الراحمین ہے۔ ہم نے اس کی دعا قبول کی اور تو تکلیف اُسے تھی اُس کو دور کر دیا، اور صرف اس کے اہل و عیال ہی اس کو نہیں دیکھے بلکہ ان کے ساتھ اتنے لیکن سب کے قیاسات کی بنیاد اُس سفر ایوب یا صحیفہ ایوب پر ہے جو بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں شامل ہے۔ اسی کی زبان، انداز بیان اور مواد کلام کو دیکھ کر یہ مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں، نہ کہ کسی اور تاریخی شہادت پر۔ اور اس سفر ایوب کا حال یہ ہے کہ اس کے اپنے مضامین میں بھی تضاد ہے اور اس کا بیان قرآن مجید کے بیان سے بھی اتنا مختلف ہے کہ دونوں کو بیک وقت نہیں مانا جاسکتا۔ لہذا ہم اُس پر قطعاً اعتقاد نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ قابل اعتقاد شہادت اگر کوئی ہے تو وہ یہ ہے کہ یسعیاہ نبی اور موسیٰ اہل نبی کے صحیفوں میں ان کا ذکر آیا ہے اور یہ صحیفے تاریخی حیثیت سے زیادہ مستند ہیں۔ یسعیاہ نبی آٹھویں صدی اور موسیٰ اہل نبی چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں، اس لیے یہ امر یقینی ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نویں صدی یا اس سے پہلے کے بزرگ ہیں۔ وہی ان کی قومیت تو سورہ نساء (رکوع ۲۳) اور سورہ انعام (رکوع ۱۰) میں جس طرح ان کا ذکر آیا ہے اس سے گمان تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے تھے، مگر وہ بنی اسرائیل کا یہ بیان بھی کچھ بعید از قیاس نہیں ہے کہ وہ حضرت اسحاق کے بیٹے عیسو کی نسل سے تھے۔

لکھے دعا کا انداز کس قدر لطیف ہے۔ مختصر ترین الفاظ میں اپنی تکلیف کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد بس یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ تو رحم الراحمین ہے۔ آگے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں، کوئی عرض مدعا نہیں، کسی چیز کا مطالبہ نہیں۔ اس طرز دعا میں کچھ ایسی شان نظر آتی ہے جیسے کوئی انتہائی صابر و قانع اور شریف و خوددار آدمی ہے درپے فاتر سے بے تاب ہو اور کسی نہایت کریم النفس ہستی کے سامنے بس اتنا کہہ کر رہ جائے کہ میں مجھ کو کاموں اور آپ قیاس ہیں۔ آگے کچھ اس کی زبان سے نہ نکل سکے۔

مع سورہ ص کے چوتھے رکوع میں اس کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا اذْکُفْ بِرِجْدِكَ هَذَا مُغْتَسِلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ، اپنا پاؤں مارو، یہ ٹھنڈا پانی موجود ہے نہانے کو اور پینے کو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر پاؤں مارتے ہی اللہ نے ان کے لیے ایک قدرتی چشمہ جاری کر دیا جس کے پانی میں یہ خاصیت تھی کہ اس سے غسل کرنے اور اس کو پینے سے ان کی بیماری دور ہو گئی۔ یہ علاج اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ان کو کوئی سخت

ہی اور بھی دیے، اپنی خاص رحمت کے طور پر، اور اس لیے کہ یہ ایک سبق ہو عبادت گزاروں کے لیے۔
جلدی بیماری ہو گئی تھی، اور بائبل کا بیان بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان کا جسم سر سے پاؤں تک پھوڑوں سے بھر گیا
تھا (ایوب، باب ۲، آیت ۷)۔

۱۷۷ اس قصے میں قرآن مجید حضرت ایوب کو اس شان سے پیش کرتا ہے کہ وہ صبر کی تصویر نظر آتے ہیں، اور
پھر کہتا ہے کہ ان کی زندگی عبادت گزاروں کے لیے ایک نمونہ ہے۔ لیکن دوسری طرف بائبل کی سفر ایوب پڑھیے
تو وہاں آپ کو ایک ایسے شخص کی تصویر نظر آئے گی جو خدا کے خلاف مجسم شکایت، اور اپنی مصیبت پر سمہ تن فریاد
بنا ہوا ہے۔ بار بار اُس کی زبان سے یہ فقرے ادا ہوتے ہیں ”نالوہو وروہ دن جس میں میں پیدا ہوا“ ”میں رحم
ہی میں کیوں نہ مر گیا“ ”میں نے پیٹ سے نکلنے ہی کیوں نہ جان دے دی“ اور بار بار وہ خدا کے خلاف شکایتیں
کرتا ہے کہ ”تاوہ مطلق کے تیر میرے اندر لگے ہوئے ہیں، میری روح انہی کے زہر کو پی رہی ہے، خدا کی ڈراؤنی
باتیں میرے خلاف صف باندھے ہوئے ہیں“ ”اے بنی آدم کے ناظر، اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تیرا کیا بگاڑتا
ہوں؟ تو نے کیوں مجھے اپنا نشانہ بنا لیا ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ پر بوجھ ہوں؟ تو میرا گناہ کیوں نہیں مٹا
کہ تا اور میری بدکاری کیوں نہیں دور کر دیتا؟“ ”میں خدا سے کہوں گا کہ مجھے ملزم نہ ٹھیرا مجھے تاکہ تو مجھ سے کیوں
جھگڑتا ہے؟ کیا تجھے اچھا لگتا ہے کہ اندھیر کرے اور اپنے ہاتھوں کی نیائی ہوئی چیز کو حقیر جانے اور شہریوں
کی مشورت کو روشن کرے؟ اُس کے تین دوست اگر اسے تسلی دیتے ہیں اور اس کو صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کتے
ہیں، مگر وہ نہیں مانتا۔ وہ ان کی تلقین کے جواب میں پے در پے خدا پر الزام رکھے چلا جاتا ہے اور ان کے
سمجھانے کے باوجود اصرار کرتا ہے کہ خدا کے اس فعل میں کوئی حکمت و مصلحت نہیں ہے، صرف ایک ظلم ہے
جو مجھ جیسے ایک متقی و عبادت گزار آدمی پر کیا جا رہا ہے۔ وہ خدا کے اس انتظام پر سخت اعتراضات کرتا ہے کہ
ایک طرف بدکار نوازے جاتے ہیں اور دوسری طرف نیکو کار ستائے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک کر کے اپنی
نیکیاں گناتا ہے اور پھر وہ تکلیفیں بیان کرتا ہے جو ان کے بدلے میں خدا نے اس پر ڈالیں، اور پھر کہتا ہے کہ
خدا کے پاس اگر کوئی جواب ہے تو وہ مجھے بتائے کہ یہ سلوک میرے ساتھ کس تصور کی پاداش میں کیا گیا ہے اس
کی بیزبان درازی اس لیے خالق کے مقابلے میں اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ آخر کار اُس کے دوست اس کی باتوں کا

جواب دینا پھڑکتے ہیں۔ وہ چپ بوجھتے ہیں تو ایک چوتھا آدمی جو ان کی باتیں خاموش سن رہا تھا بیچ میں دخل دیتا ہے اور ایوب کو بے تحاشا اس بات پر ڈاٹتا ہے کہ ”اُس نے خدا کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو راست ٹھیرایا۔“ اس کی تقریر ختم نہیں ہوتی کہ بیچ میں اللہ میاں خود بول پڑتے ہیں اور پھر ان کے اور ایوب کے درمیان خوب دُوبد و بحث ہوتی ہے۔ اس ساری داستان کو پڑھتے ہوئے کسی جگہ بھی ہم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اُس صبرِ محکم کا حال اور کلام پڑھ رہے ہیں جس کی تصویر عبادت گزاروں کے لیے سبق بنا کر قرآن نے پیش کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کتاب کا ابتدائی حصہ کچھ کہہ رہا ہے، بیچ کا حصہ کچھ، اور آخر میں نتیجہ کچھ اور نکل آتا ہے۔ تینوں حصوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ ابتدائی حصہ کہتا ہے کہ ایوب ایک نہایت راست باز، خدا ترس اور نیک شخص تھا، اور اس کے ساتھ اتنا دولت مند کہ ”اہل مشرق میں وہ سب سے بڑا آدمی تھا“ ایک روز خدا کے ہاں اُس کے (یعنی خود اللہ میاں کے) بیٹے حاضر ہوئے اور ان کے ساتھ شیطان بھی آیا۔ خدا نے اس محفل میں اپنے بندے ایوب پر فخر کا اظہار کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے جو کچھ اسے دے رکھا ہے اُس کے بعد وہ شکر نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔ ذرا اس کی نعمت چھین کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر نہ کرے تو میرا نام شیطان نہیں۔ خدا نے کہا، اچھا اُس کا سب کچھ تیرے اختیار میں دیا جاتا ہے البتہ اس کی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ۔ شیطان نے جا کر ایوب کے تمام مال و دولت کا اور اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا اور ایوب ہر چیز سے محروم ہو کر بالکل اکیلا رہ گیا۔ مگر ایوب کی آنکھ پر میل نہ آیا۔ اس نے خدا کو سجدہ کیا اور کہا ”ننگا ہی میں اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا اور ننگا ہی واپس جاؤں گا۔ خداوند نے دیا اور خداوند نے لے لیا۔ خداوند کا نام مبارک ہو“ پھر ایک دن ویسی ہی محفل اللہ میاں کے ہاں تھی۔ ان کے بیٹے بھی آئے اور شیطان بھی حاضر ہوا۔ اللہ میاں نے شیطان کو بتایا کہ دیکھ لے، ایوب کیسا راست باز آدمی ثابت ہوا۔ شیطان نے کہا، جناب، ذرا اس کے جسم پر مصیبت ڈال کر دیکھیے۔ وہ آپ کے منہ پر آپ کی تکفیر کرے گا۔ اللہ میاں نے فرمایا، اچھا، جا، اُس کو تیرے اختیار میں دیا گیا، بس اس کی جان محفوظ رہے۔ چنانچہ شیطان واپس ہوا اور اُس نے ”ایوب کو تلوے سے چاند تک دردناک پھڑوں سے دکھ دیا“ اس کی

بیوی نے اس سے کہا: "کیا تو اب بھی اپنی راستی پر قائم رہے گا؟ خدا کی تکفیر کو اور مر جا!" اس نے جواب دیا: "تو ناوانِ عہدت کی ہی باتیں کرتی ہے۔ کیا ہم خدا کے ہاتھ سے سکھ پائیں اور دکھ نہ پائیں؟"

یہ ہے سیدنا ایوب کے پہلے اور دوسرے باب کا خلاصہ۔ لیکن اس کے بعد تفسیر کے باب سے ایک دوسرا ہی مضمون شروع ہوتا ہے جو بابِ ایسویں بابت تک ایوب کی بے صبری اور خدا کے خلاف شکایات و الزامات کی ایک مسلسل داستان ہے، اور اس سے پوری طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ایوب کے بارے میں خدا کا اندازہ غلط اور شیطان کا اندازہ صحیح تھا۔ پھر بابِ ایسویں باب میں عاقبت اس بات پر ہوتا ہے کہ اللہ میاں سے خوب و بد و محبت کر لینے کے بعد، صبر و شکر اور توبہ کی بنا پر نہیں بلکہ اللہ میاں کی ڈانٹ کھا کر، ایوب ان سے معافی مانگ لیتا ہے اور وہ اسے قبول کر کے اس کی تکلیفیں دور کر دیتے ہیں اور تینا کچھ پہلے اس کے پاس تھا اس سے دو چھوڑا اسے دے دیتے ہیں۔ اس آخری حصے کو پڑھتے وقت آدمی کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایوب اور اللہ میاں، دونوں شیطان کے چیلنج کے مقابلے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں، اور پھر محض اپنی بات رکھنے کے لیے اللہ میاں نے ڈانٹ ڈپٹ کر اسے معافی مانگنے پر مجبور کیا ہے، اور اس کے معافی مانگنے ہی اسے قبول کر لیا ہے تاکہ شیطان کے سامنے ان کی سبٹی نہ ہو۔

یہ کتاب خود اپنے منہ سے بول رہی ہے کہ یہ نہ خدا کا کلام ہے، نہ خود حضرت ایوب کا۔ بلکہ حضرت ایوب کے زمانے کی بھی نہیں ہے۔ ان کے صدیوں بعد کسی شخص نے قصہ ایوب کو بنیاد بنا کر یوسف زلیخا کی طرح ایک داستان لکھی ہے اور اس میں ایوب، ایبفرشیانی، سوخی بلدو، نعمانی صوفی، برائیل بوزی کاٹیا ایو، چند کیرکٹریں جن کی زبان سے نظام کائنات کے متعلق دراصل وہ خود اپنا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ اس کی شاعری اور اس کے زورِ بیان کی جس قدر جی چاہے داد دے لیجیے، مگر کتب مقدسہ کے مجموعے میں ایک صحیفہ آسمانی کی حیثیت سے اس کو جگہ دینے کے کوئی معنی نہیں۔ ایوب علیہ السلام کی سیرت سے اس کا بس اتنا ہی تعلق ہے جتنا "یوسف زلیخا" کا تعلق سیرتِ یوسفی سے ہے، بلکہ شاید اتنا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے ابتدائی اور آخری حصے میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں ان میں صحیح تاریخ کا ایک عنصر پایا جاتا ہے، اور وہ شاعر نے یا تو زبانی روایات سے لیا ہو گا جو اس کے زمانے میں مشہور ہو گئی، یا پھر کسی صحیفے سے اخذ کیا ہو گا جو اب ناپید ہے۔

اور یہی نعمت اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفلؑ کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے۔ اور ان کو ہم نے

سے تشریح کے لیے سورہ مریم رکوع ۴ کے حواشی ملاحظہ ہوں

لہذا ذوالکفل کا لفظی ترجمہ ہے "صاحب نصیب"، اور مراد ہے اخلاقی بزرگی اور ثوابِ آخرت کے لحاظ سے صاحبِ نصیب، نہ کہ دنیوی فوائد و منافع کے لحاظ سے۔ یہ ان بزرگ کا نام نہیں بلکہ لقب ہے۔ قرآن مجید دو جگہ ان کا ذکر آیا ہے اور دونوں جگہ ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ نام نہیں دیا گیا۔

مفسرین کے اقوال اس معاملہ میں بہت مضطرب ہیں کہ یہ بزرگ کون ہیں، کس ملک اور قوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور کس زمانے میں گزرے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حضرت زکریا کا دوسرا نام ہے (حالانکہ یہ صریحاً غلط ہے، کیونکہ ان کا ذکر ابھی آگے آ رہا ہے)، کوئی کہتا ہے یہ حضرت ایسا ہیں، کوئی یوشع بن نون کا نام بتاتا ہے، کوئی کہتا ہے ایسیح ہیں (حالانکہ یہ بھی غلط ہے، سورہ ص میں ان کا ذکر الگ کیا گیا ہے اور ذوالکفل کا الگ)، کوئی انہیں حضرت ایسیح کا خلیفہ بتاتا ہے، اور کسی کا قول ہے کہ یہ حضرت ایوب کے بیٹے تھے جو ان کے بعد نبی ہوئے اور ان کا اصلی نام بشر تھا۔ آلودی نے روح المعانی میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ حزقیال (حزقی ایل) نبی ہیں جو بنی اسرائیل کی اسیری کے زمانے میں نبوت پر سرفراز ہوئے اور نہر خابور کے کنارے ایک بستی میں فرائضِ نبوت انجام دیتے رہے۔

ان مختلف اقوال کی موجودگی میں یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل نبی کی طرف ظاہر کیا ہے، لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی نہیں ملی جس کی بنا پر یہ رائے قائم کی جاسکے۔ تاہم اگر اس کے لیے کوئی دلیل مل سکے تو یہ رائے قابلِ ترجیح ہو سکتی ہے، کیونکہ بائبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں جو اس آیت میں کی گئی ہے، یعنی صابر اور صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نوآبادی دیہائے خابور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔ اسی مقام پر ۱۹۵۵ ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے، جبکہ ان کی عمر ۳۰ سال تھی، اور مسلسل ۲۲ سال ایک طرف گرفتار بلا اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف

اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے۔

اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا۔ یاد کرو جبکہ وہ بگڑ کر چلا گیا اور سمجھا کہ ہم اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں سے پکارا۔ نہیں ہے کوئی خدا مگر تو، پاک ہے تیری ذات بے شک میں نے تصور کیا۔ تب ہم نے اس کی دعا قبول کی اور غم سے اس کو نجات بخشی، اور اسی طرح ہم مومنوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔

اور زکریا کو، جبکہ اس نے اپنے رب کو پکارا کہ "اے پروردگار، مجھے اکیلا نہ چھوڑ، اور بہترین

یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کو چونکانے کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کا عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا اُس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال ان کی بیوی، جنہیں وہ خود "منظورِ نظر" کہتے ہیں، انتقال کر جاتی ہیں، لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں، اور یہ اپنا دکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اُس عذاب سے ڈرنا شروع کر دیتے ہیں جو اُس کے سر پر تھلا کھڑا تھا (باب ۲۲- آیات ۱۵-۷۲)۔ بائبل کا صحیفہ حزقی ایل ان صحیفوں میں سے ہے جنہیں پڑھ کر واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الہامی کلام ہے۔

۱۷ مراد میں حضرت یونس۔ کہیں ان کا نام لیا گیا ہے اور کہیں "ذوالنون" اور "صاحب الموت" یعنی "مچھلی والے" کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مچھلی والا انہیں اس لیے نہیں کہا گیا کہ وہ مچھلیاں بکرتے یا بیچتے تھے بلکہ اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا تھا جیسا کہ سورہ صافات (رکوع ۱۵) میں بیان ہوا ہے۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲-۲۱۳۔

۱۸ یعنی وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر چلے گئے قبل اس کے کہ خدا کی طرف سے ہجرت کا حکم آتا اور ان کے لیے اپنی ڈیوٹی چھوڑنا جائز ہوتا۔

۱۹ انہوں نے خیال کیا کہ اس قوم پر تو عذاب آنے والا ہے۔ اب مجھے کہیں چل کر پناہ یعنی چاہیے تاکہ بخیر و خوبی عذاب میں نہ گھر جاؤں۔ گویا وہ اس گمان میں تھے کہ وہ خود اپنی تدبیر سے اپنے آپ کو عذاب سے بچا سکتے ہیں۔

وارث تو توہی ہے۔ پس ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے بچی عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں ڈوڑ دھوپ کرتے تھے اور میں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے جھکے ہوئے تھے۔

اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی۔ ہم نے اُس کے اندر اپنی رُوح سے

ہم یعنی مچھلی کے پیٹ میں سے جو خود تاریک تھا، اور اوپر سے سمندر کی تاریکیاں فرید۔

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۲۴ تا ۲۵۔ اور سورہ مریم رکوع اول کے حواشی۔ بیوی کو درست کر دینے سے مراد ان کا باپچہ پن دور کر دینا اور سن رسیدگی کے باوجود حمل کے قابل بنا دینا ہے۔ بہترین ارث تو توہی ہے، یعنی تو اولاد نہ بھی دے تو غم نہیں، تیری ذات پاک وارث ہونے کے لیے کافی ہے۔

کھہ اس سیاق و سباق میں انبیاء کا ذکر جس مقصد کے لیے کیا گیا ہے اسے پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ حضرت زکریا کے واقعے کا ذکر کرنے سے یہ ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ یہ سارے نبی محض بندے اور انسان تھے۔ الوہیت کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ دوسروں کو اولاد بخشنے والے نہ تھے بلکہ خود اللہ کے آگے اولاد کے لیے ہاتھ پھیلاتے ولے۔ تھے۔ حضرت یونس کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ایک نبی اولوالعزم ہونے کے باوجود جیب ان سے قصور سرزد ہوا تو سزا دے ڈالی گئی، اور جب وہ اپنے رب کے آگے جھک گئے تو ان پر فضل بھی ایسا کیا گیا کہ مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال لائے گئے۔ حضرت ایوب کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ نبی کا قبلائے مصیبت ہونا کوئی زالی بات نہیں ہے، اور نبی بھی جب مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو خدا ہی کے آگے شفا کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ وہ دوسروں کو شفا دینے والا نہیں، خدا سے شفا مانگنے والا ہوتا ہے۔ پھر ان سب باتوں کے ساتھ ایک طرف یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ یہ سارے انبیاء تو جید کے قائل تھے اور اپنی حاجات ایک خدا کے سوا کسی کے سامنے نہ لے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ بھی جانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ غیر معمولی طور پر اپنے نبیوں کی مدد کرتا رہا ہے، آغاز میں خواہ کسی ہی آزمائشوں سے ان کو سابقہ پیش آیا ہو مگر آخر کار ان کی دعائیں معجزانہ شان کے ساتھ پوری ہوتی ہیں۔

مراد میں حضرت مریم علیہا السلام۔

پھونکا اور اسے اور اس کے بیٹے کو دیا بھر کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔^{۹۹}

یہ تمہاری امت حقیقت میں ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس تم میری عبادت کرو۔ مگر یہ لوگوں کی کارستانی ہے کہ، انہوں نے آپس میں اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔^{۱۰۰}

۹۹ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ اِنِّیْ خَلَقْتُ لَبَّشًا اَمِّنْ طِبْنِ فَاِذَا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَفَعَّوْا لَهٗ سَاجِدِيْنَ رص۔ رکوع ۵)۔ میں مٹی سے ایک بشر بنا رہا ہوں، پس رے فرستو، جب میں اسے پورا بنا لوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ اور یہی بات حضرت عیسیٰ کے متعلق مختلف مقامات پر فرمائی گئی ہے۔ سورہ نسا میں فرمایا۔ دَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهُ اَلْقَهَا اِلٰی هٰرِيْمٍ وَ رُوْحٍ مِّنْهُ (رکوع ۲۳) اللہ کا رسول اور اس کا فرمان جو مریم کی طرف اتھا کیا گیا اور اس کی طرف سے ایک روح ۱۰ اور سورہ تحریم میں ارشاد ہوا وَ صَرَّيْمٍ نَّبِيَّتِ عِمْرَانَ الَّذِيْ اٰخَصَّنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (رکوع ۲) اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی پس پھونک دیا ہم نے اس میں اپنی روح سے ۱۰ اس کے ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور حضرت آدم کی پیدائش کو ایک دوسرے کے مشابہ قرار دیتا ہے، چنانچہ سورہ آل عمران میں فرمایا اِنَّ مَثَلَ عِيسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ، خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (رکوع ۶)۔ عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے جس کو اللہ نے مٹی سے بنایا پھر فرمایا ہو جا اور وہ موجود تھا۔ ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ معمولی طریقہ تخلیق کے بجائے جب اللہ تعالیٰ کسی کو براہ راست اپنے حکم سے وجود میں لا کر زندگی بخشتا ہے تو اس کو اپنی روح سے پھونکنے کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ اس روح کی نسبت اللہ کی طرف کس معنی میں ہے، او اس کے پھونکنے کا ٹھیک مطلب کیا ہے، اس کو ہم نہ جان سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے ہیں۔ مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۴۲۷ - ۴۲۸۔

۱۰۰ یعنی یہ دونوں ماں بیٹے خدا یا خدائی نہیں شریک نہ تھے بلکہ خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشان تھے۔ نشانی وہ کس معنی میں تھے، اس کی تشریح سورہ مریم رکوع ۲ کے حواشی میں گزر چکی ہے۔

۱۰۱ تم کا خطاب تمام انسانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے انسانو، تم سب حقیقت میں ایک ہی

سب کو ہماری طرف پلٹنا ہے پھر جو نیک عمل کرے گا، اس حال میں کہ وہ مومن ہو، تو اس کے کام کی ناقدری نہ ہوگی، اور اُسے ہم لکھ رہے ہیں۔ اور ممکن نہیں ہے کہ جس مستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ہو وہ پھر پلٹ سکے۔ یہاں تک کہ جب یا جوج و ما جوج کھول دیئے جائیں گے اور ہر ملندی سے وہ نکل پڑیں گے اور وعدہ برحق کے پورا ہونے کا وقت قریب آگے گا تو یکایک ان لوگوں کے ویدے

امت اور ایک ہی ملت تھے، دنیا میں جتنے نبی بھی آئے وہ سب ایک ہی دین لے کر آئے تھے، اور وہ اصل دین یہ تھا کہ صرف ایک اللہ ہی انسان کا رب ہے اور اکیلے اللہ ہی کی بندگی و پرستش کی جانی چاہیے۔ بعد میں جتنے مذاہب پیدا ہوئے وہ اسی دین کو بگاڑ کر بنا لیے گئے۔ اُس کی کوئی چیز کسی نے لی، اور کوئی دوسری چیز کسی اور نے، اور پھر ہر ایک نے ایک جُز اُس کا لے کر بہت سی چیزیں اپنی طرف سے اس کے ساتھ ملا ڈالیں۔ اس طرح یہ بے شمار ملتیں وجود میں آئیں۔ اب یہ خیال کرنا کہ فلاں نبی فلاں مذہب کا بانی تھا اور فلاں نبی فلاں مذہب کی بنا ڈالی، اور انسانیت میں یہ ملتوں اور مذہبوں کا تفرقہ انبیاء کا ڈالا ہوا ہے، محض ایک خلط خیال ہے۔ محض یہ بات کہ مختلف ملتیں اپنے آپ کو مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے انبیاء کی طرف منسوب کر رہی ہیں، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ملتوں اور مذہبوں کا یہ اختلاف انبیاء کا ڈالا ہوا ہے۔ خدا کے نیچے ہوئے انبیاء دس مختلف مذہب نہیں بنا سکتے تھے اور نہ ایک خدا کے سوا کسی اور کی بندگی سکھا سکتے تھے۔

۱۱۰ اس آیت کے تین مطلب ہیں:

ایک یہ کہ جس قوم پر ایک مرتبہ عذاب الہی نازل ہو چکا ہو وہ پھر کبھی نہیں اٹھ سکتی۔ اس کی نشاۃ ثانیہ اور اس کی حیاتِ نو ممکن نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ ہلاک ہو جانے کے بعد پھر اس دنیا میں اُس کا پلٹنا اور اسے دوبارہ امتحان کا موقع ملنا غیر ممکن ہے۔ پھر تو اللہ کی عدالت ہی میں اس کی پیشی ہوگی۔

تیسرے یہ کہ جس قوم کی بدکاریاں اور زیادتیاں اور بدایتِ حق سے پیہم رہ گزریاں اس حد تک پہنچ جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہو جاتا ہے، اُسے پھر رجوع اور توبہ و انابت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ اُس کے لیے پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ ضلالت سے ہدایت کی طرف پلٹ سکے۔

پھٹے کے پھٹے رہ جائیں گے جنہوں نے کفر کیا تھا۔ کہیں گے "ہائے ہماری کم نختی، ہم اس چیز کی طرف سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، بلکہ ہم خطا کار تھے۔" اُن سے کہا جائے گا "تم، اور تمہارے وہ معبود جنہیں تم پوجتے تھے، جہنم کا لقمہ ہو، وہیں تم کو جانا ہے۔" اگر یہ واقعی خدا ہوتے تو وہاں

۹۳ یا جوج و ماجوج کی تشریح سورہ کہف رکوع ا کے حواشی میں کی جا چکی ہے۔ اُن کے کھول دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دنیا پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے کہ جیسے کوئی تیکاری دوندہ لیک ایک پیچھے یا بندھن سے چھوڑ دیا گیا ہو۔ وعدہ حق پورا ہونے کا وقت قریب آگئے گا۔ کا اشارہ صاف طور پر اس طرف ہے کہ یا جوج و ماجوج کی یہ عالمگیر یورش آخری زمانہ میں ہوگی اور اس کے بعد جلدی ہی قیامت آجائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد اس معنی کو اور زیادہ کھولی دیتا ہے جو مسلم نے حذیفہ بن اسید الغفاری کی روایت سے نقل کیا ہے کہ قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ تم اس سے پہلے دس علامتیں نہ دیکھ لو۔ دھواں، دجال، آتہ الارض، مغرب سے سورج کا طلوع، عیسیٰ ابن مریم کا نزول، یا جوج و ماجوج کی یورش، اور تین بڑے خوف رزین کا دھنسا یا (LANDSLIDES)۔ ایک مشرق میں، دوسرا مغرب میں، اور تیسرا جزیرۃ العرب میں، پھر سب سے آخر میں یمن سے ایک سخت آگ اٹھے گی جو لوگوں کو محشر کی طرف ہانکے گی (یعنی بس اس کے بعد قیامت آجائے گی) ایک اور حدیث میں یا جوج و ماجوج کی یورش کا ذکر کر کے حضور نے فرمایا اُس وقت قیامت اس قدر قریب ہوگی جیسے پورے پٹیوں کی حاملہ کہہ سکتے کب وہ بچہ جن دسے، رات کو یا دن کو رکال کا حامل المتم لایدری اہلما متی لفقوھم بولدھا لیلا اونھارا۔

۹۴ "غفلت" میں پھر ایک طرح کی معذرت پائی جاتی ہے، اس لیے وہ اپنی غفلت کا ذکر کرنے کے بعد پھر خود ہی صاف صاف اعتراف کریں گے کہ ہم کو انبیاء نے اگر اس دن سے خبردار کیا تھا، لہذا درحقیقت ہم غافل و بے خبر نہ تھے بلکہ خطا کار تھے۔

۹۵ روایات میں آیا ہے کہ اس آیت پر عبداللہ بن الزبیری نے اعتراض کیا کہ اس طرح تو صرف ہمارے ہی معبود نہیں، مسیح اور عزیٰرا اور ملائکہ بھی جہنم میں جائیں گے، کیونکہ دنیا میں ان کی بھی عبادت کی جاتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، نعوذ کل من احدث ان لیعبد من دون اللہ فهو مع من عبدا،

نہ جاتے۔ اب سب کو ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ وہاں وہ چھنکارے ماریں گے اور حال یہ ہو گا کہ اس میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیگی۔ رہے وہ لوگ جن کے لیے ہماری طرف سے جہلائی کا پہلے ہی فیصلہ ہو چکا ہو گا، تو وہ یقیناً اس سے دور رکھے جائیں گے، اس کی سرسراہٹ تک نہ سنیں گے، اور

”ہاں، بروہ شخص جس نے پسند کیا کہ اللہ کے بجائے اُس کی بندگی کی جائے وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جنہوں نے اس کی بندگی کی۔“ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے خلق خدا کو خدا پرستی کی تعلیم دی تھی اور لوگ انہی کو معبود بنا بیٹھے، یا جو غریب اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ دنیا میں ان کی بندگی کی جا رہی ہے اور اس فعل میں ان کی خواہش اور مرضی کا کوئی دخل نہیں ہے، ان کے جہنم میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس شرک کے فائدہ مند نہیں ہیں۔ البتہ جنہوں نے خود معبود بننے کی کوشش کی اور جن کا خلق خدا کے اس شرک میں واقعی دخل ہے وہ سب اپنے عابدوں کے ساتھ جہنم میں جائیں گے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جہنم میں جائیں گے جنہوں نے اپنی اغراض کے لیے غیر اللہ کو معبود بنوایا تھا۔ شیطان بھی اسی ذیل میں آتا ہے، کیونکہ اُس کی تحریک پر جن ہستیوں کو معبود بنایا جاتا ہے، اصل معبود وہ نہیں بلکہ خود شیطان ہوتا ہے جس کے امر کی اطاعت میں یہ فعل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پتھر اور لکڑی کے بتوں اور دوسرے سامان پرستش کو بھی مشرکین کے ساتھ جہنم میں داخل کیا جائے گا تاکہ وہ ان پر آتش جہنم کے اور زیادہ بھڑکنے کا سبب بنیں اور یہ دیکھ کر انہیں مزید تکلیف ہو کہ جن سے وہ شفاعت کی امیدیں لگائے بیٹھے تھے وہ اُن پر اُلٹے عذاب کی شدت کے موجب بنے ہوتے ہیں۔

۱۹۶ اصل میں لفظ زفر استعمال ہوا ہے۔ سخت گرمی، محنت اور لکان کی حالت میں جب آدمی لمبا سانس لے کر اُس کو ایک چھنکار کی شکل میں نکالتا ہے تو اسے عربی میں زفر کہتے ہیں۔

۱۹۷ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں نیکی اور سعادت کی راہ اختیار کی۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ پہلے ہی یہ وعدہ فرما چکا ہے کہ وہ اس کے عذاب سے محفوظ رہیں گے اور ان کو نجات دی جائے گی۔

وہ ہمیشہ ہمیشہ اپنی من لجاتی چیزوں کے درمیان میں گئے۔ انتہائی گھبراہٹ کا وقت ان کو فورا پریشان نہ کرے گا، اور مالک بڑھ کر ان کو ہاتھوں ہاتھ میں گئے کہ یہ تمہارا وہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

وہ دن جبکہ آسمان کو ہم ٹوں لپیٹ کر رکھ دیں گے جیسے طومار میں اوراق لپیٹ دیئے جاتے ہیں۔ جس طرح پہلے ہم نے تخلیق کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم پھر اس کا اعادہ کریں گے۔ یہ ایک وعدہ ہے ہمارے ذمے، اور یہ کام ہمیں بہر حال کرنا ہے۔ اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہونگے، اس میں ایک بڑی خبر ہے عبادت گزار لوگوں کے لیے۔

۵۹۸ یعنی روزِ محشر اور خدا کے حضور پیشی کا وقت، جو عام لوگوں کے لیے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہوگا، اس وقت نیک لوگوں پر ایک اطمینان کی کیفیت طاری رہے گی۔ اس لیے کہ سب کچھ ان کی توقعات کے مطابق ہو رہا ہوگا۔ ایمان و عمل صالح کی جو پونجی لیے ہوئے وہ دنیا سے رحمت ہوئے تھے وہ اس وقت خدا کے فضل سے ان کی ڈھارس نہ بھائے گی اور خوف و حزن کے بجائے ان کے دلوں میں یہ امید پیدا کرے گی کہ عنقریب وہ اپنی سعی کے نتائج خیر سے ہم نوار ہونے والے ہیں۔

۵۹۹ اس آیت کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور اس سے ایک ایسا مطلب نکال لیا جو پورے قرآن کی تردید اور پورے نظام دین کی بیخ کنی کر دیتا ہے۔ وہ آیت کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ زندگی میں زمین کی وراثت (یعنی حکومت و فرمانروائی اور زمین کے وسائل پر تصرف) صرف صالحین کو ملا کرتی ہے اور انہی کو اللہ تعالیٰ اس نعمت سے نوازتا ہے۔ پھر اس قاعدہ کلیہ سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صالح اور غیر صالح کے فرق و امتیاز کا معیار یہی وراثت زمین ہے۔ جس کو یہ وراثت ملے وہ صالح ہے اور جس کو نہ ملے وہ غیر صالح۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ کر ان قوموں پر نگاہ ڈالتے ہیں جو دنیا میں پہلے وراثت زمین رہی ہیں اور آج اس وراثت کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ یہاں وہ دیکھتے ہیں کہ انہی شرکت دہریہ، ناسق، فاجر، سب پر وراثت پہلے مل چکی پاتے رہے ہیں اور آج بھی پارسی ہیں۔ ان قوموں میں وہ

تمام اوصاف پائے گئے ہیں اور آج پائے جاتے ہیں جنہیں قرآن صاف الفاظ میں کفر، فسق، فجور، مصیبت اور بدی سے تعبیر کرتا ہے، وہ اس وراثت سے محروم نہیں ہوئیں بلکہ نوازی گئیں اور آج بھی نوازی جا رہی ہیں۔ نزعون و مردو سے لے کر اسٹالن تک کتنے ہی ہیں جو کھلم کھلا خدا کے منکر، مخالف، بلکہ تاقابل بنے ہیں اور پھر بھی وراثت زمین ہوئے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر وہ یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدہ کبھی تو غلط نہیں ہو سکتا، اب لامحالہ غلطی جو کچھ ہے وہ ”صلاح“ کے اُس مفہوم میں ہے جو اب تک مسلمان سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ صلاح کا ایک نیا تصور تلاش کرتے ہیں جس کے مطابق زمین کے وراثت ہونے والے سب لوگ یکساں ”صلاح“ قرار پاسکیں، قطع نظر اس سے کہ وہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق ہوں یا چنگیز اور ہلاکو۔ اس نئے تصور کی تلاش میں علماء دن کا نظریہ ارتقا و ان کی رہنمائی کرتا ہے اور وہ قرآن کے تصور صلاح کو ڈاروینی تصور ”صلاحیت“ (FITNESS) سے جا کر ملا دیتے ہیں۔

اس نئی تفسیر کی رو سے آیت زیر بحث کے معنی یہ قرار پاتے ہیں کہ جو شخص اور گروہ بھی مالک کو فتح کرنے اور ان پر زور و قوت کے ساتھ اپنی حکومت چلانے اور زمین کے وسائل کو کامیابی کے ساتھ استعمال کرنے کی قابلیت رکھتا ہو وہی ”خدا کا صالح بندہ“ ہے اور اُس کا یہ فعل تمام ”عابد“ انسانوں کے لیے ایک پیغام ہے کہ ”عبادت“ اس چیز کا نام ہے جو شخص اور گروہ کر رہا ہے، اگر یہ عبادت تم نہیں کرتے اور نتیجہ میں زمین سے محروم رہ جاتے ہو تو نہ تمہارا شمار صالحین میں ہو سکتا ہے اور نہ تم کو خدا کا عبادت گزار بندہ کہا جا سکتا ہے۔

یہ معنی اختیار کرنے کے بعد ان حضرات کے سامنے یہ سوال آیا کہ اگر ”صلاح“ اور ”عبادت“ کا تصور یہ ہے تو پھر وہ ایمان (ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالرسول اور ایمان بالکتاب) کیا ہے جس کے بغیر خود اسی قرآن کی رو سے، خدا کے ہاں کوئی عمل صالح مقبول نہیں؟ اور پھر قرآن کی اس دعوت کے کیا معنی ہیں کہ اُس نظام اخلاق اور قانون زندگی کی پیروی کرو جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ بھیجا ہے؟ اور پھر قرآن کا بار بار یہ کہنا کیا معنی رکھتا ہے کہ جو رسول کو نہ مانے اور خدا کے نازل کردہ احکام کا اتباع نہ کرے وہ کافر، فاسق، عذاب کا مستحق اور منضوب بارگاہ خداوندی ہے؟ یہ سوالات ایسے تھے کہ اگر یہ لوگ ان پر ایمان لائی

کے ساتھ غور کرتے تو محسوس کر لیتے کہ ان سے اس آیت کا مطلب سمجھنے اور صلاح کا ایک نیا تصور قائم کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی غلطی محسوس کرنے کے بجائے پوری جسارت کے ساتھ ایمان، اسلام، توحید، آخرت، رسالت، ہر چیز کے معنی بدل ڈالے تاکہ وہ سب ان کی اس ایک آیت کی تفسیر کے مطابق ہو جائیں، اور اس ایک چیز کو ٹھیک ٹھکانے کی خاطر انہوں نے قرآن کی ساری تعلیمات کو الٹ پلٹ کر ڈالا۔ اس پر طبقہ یہ ہے کہ جو لوگ ان کی اس مرمت دین سے اختلاف کرتے ہیں ان کو یہ الٹا الزام دیتے ہیں کہ خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ یہ دراصل مادی ترقی کی خواہش کا بیضہ ہے جو بعض لوگوں کو اس بُری طرح لاحق ہو گیا ہے کہ وہ قرآن کی معنوی تحریف کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

ان کی اس تفسیر میں پہلی بنیادی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کی ایسی تفسیر کرتے ہیں جو قرآن کی مجموعی تعلیمات کے خلاف پڑتی ہے، حالانکہ اصولاً قرآن کی ہر آیت کی وہی تفسیر صحیح ہو سکتی ہے جو اس کے دوسرے بیانات اور اس کے مجموعی نظام فکر سے مطابقت رکھتی ہو۔ کوئی شخص جس نے کبھی قرآن کو ایک دفعہ بھی سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس بات سے ناواقف نہیں رہ سکتا کہ قرآن جس چیز کو نیکی اور تقویٰ اور بھلائی کہتا ہے وہ "مادی ترقی اور حکم رانی کی صلاحیت" کی سہم معنی نہیں ہے، اور "صلاح" کو اگر صاحب صلاحیت کے معنی میں لے لیا جائے تو یہ ایک آیت پورے قرآن سے ٹکرا جاتی ہے۔

دوسرا سبب، جو اس غلطی کا موجب ہوا ہے، یہ ہے کہ یہ لوگ ایک آیت کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے لکھ جو معنی چاہتے ہیں اس کے الفاظ سے نکال لیتے ہیں، حالانکہ ہر آیت کے صحیح معنی صرف وہی ہو سکتے ہیں جو سیاق و سباق سے مناسبت رکھتے ہوں۔ اگر یہ غلطی نہ کی جاتی تو آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا تھا کہ اوپر سے جو مضمون مسلسل چلا آ رہا ہے وہ عالم آخرت میں مومنین صالحین اور کفار و مشرکین کے انجام سے محبت کرتا ہے۔ اس مضمون میں یکا یک اس مضمون کے بیان کرنے کا آخر کو نسا موزع تھا کہ دنیا میں وراثت زمین کا انتظام کس قاعدے پر ہو رہا ہے۔

تفسیر کے صحیح اصولوں کو ملحوظ رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب صاف یہ ہے کہ وہ عمری تخلیق میں، جس کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں ہوا ہے، زمین کے وارث صرف صالح لوگ ہونگے اور اس ابدی زندگی

کے نظام میں موجودہ عارضی نظام زندگی کی کسی کیفیت برقرار نہ رہے گی کہ زمین پر فاسقوں اور ظالموں کو بھی تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون اس سے زیادہ صریح الفاظ میں سورہ زمر کے خاتمہ پر بیان کیا گیا ہے جہاں اللہ تعالیٰ قیامت اور نفع صور اقل و ثانی کا ذکر کرنے کے بعد اپنی عدالت کا ذکر فرماتا ہے، پھر کفار کا انجام بیان کر کے نیک لوگوں کا انجام یہ بتاتا ہے کہ وَسَيُقَالُ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَئِذَا جَاءُوا نُحْتَابًا ابْوَابًا وَقَالَ لِيَوْمَ خَزَنَتُهَا سَلِّمُوا عَلَيْكُمْ رَبُّكُمْ فَاَدْخُلُوْهَا خَالِدِينَ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقْنَا وَعَدَاةً وَاَوْرَثْنَا الْاَرْضَ مِنْۢ نَّبَوَا۟ مِنْ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَا۟وْ فَنِعْمَ اٰجُرُ الْعَمِلٰتِ اور جن لوگوں نے اپنے رب کے خوف سے تقویٰ اختیار کیا تھا وہ جنت کی طرف گروہ درگروہ لے جائے جائیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ وہاں پہنچائے جائیں گے تو ان کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور اس کے منتظم ان سے کہیں گے کہ سلام ہو تم کو، تم بہت اچھے رہے، آؤ اب اس میں ہمیشہ رہنے کے لیے داخل ہو جاؤ۔ اور وہ کہیں گے کہ حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے اپنا وعدہ پورا کیا اور ہم کو زمین کا وارث کر دیا، اب ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔ پس بہترین اجر ہے عمل کرنے والوں کے لیے " دیکھیے، یہ دونوں آیتیں ایک ہی مضمون بیان کر رہی ہیں، اور دونوں جگہ وراثت زمین کا تعلق عالم آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا سے۔

اب زبور کو لیجیے جس کا حوالہ آیت زیر بحث میں دیا گیا ہے۔ اگرچہ ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ بائبل کے مجموعہ کتب مقدسہ میں زبور کے نام سے جو کتاب اس وقت پائی جاتی ہے یہ اپنی اصلی غیر محرف صورت میں ہے یا نہیں۔ کیونکہ اس میں مزامیر داؤد کے علاوہ دوسرے لوگوں کے فرامیر بھی خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اور اصلی زبور کا نسخہ کہیں موجود نہیں ہے۔ تاہم جو زبور اس وقت موجود ہے اس میں بھی نیکی اور راست بازی اور توکل کی نصیحت کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

" کیونکہ بدکردار کاٹ ڈالے جائیں گے لیکن جن کو خداوند کی آس ہے ملک کے وارث ہونگے۔ کیونکہ تھوڑی دیر میں ثمریر نابود ہو جائے گا، تو اس کی جگہ کو غور سے دیکھیے گا پر وہ نہ ہوگا، لیکن حلیم ملک کے وارث ہونگے اور سلامتی کی فراوانی سے شادماں رہیں گے

اُسے محمدؐ، ہم نے جو تم کو بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں رحمتِ منجیبت ہے۔ ان سے
 . . . ان کی میراث ہمیشہ کے لیے ہرگی . . . صادق زمین کے وارث ہونگے

اور اُس میں ہمیشہ جیسے نہیں گئے (۳ داؤد کا نمبر۔ آیات ۹-۱۰-۱۱-۱۲-۱۳-۱۴)

دیکھیے یہاں راست باز لوگوں کے لیے زمین کی وراثت کا ذکر ہے، اور ظاہر ہے کہ آسمانی کتابوں
 کی رو سے مخلوق اور ابدی زندگی کا تعلق آخرت سے ہے نہ کہ اس دنیا کی زندگی سے۔

دنیا میں زمین کی عارضی وراثت جس قاعدے پر تقسیم ہوتی ہے اسے سورہ اعراف میں اس طرح
 بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ يُعْرِضُهَا مَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهٖ، "زمین اللہ کی ہے، اپنے
 بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بنا تا ہے؛" مثبت الہی کے تحت یہ وراثت مومن
 اور کافر، صالح اور فاسق، فرماں بردار اور نافرمان، سب کو ملتی ہے۔ مگر جزائے اعمال کے طور پر نہیں بلکہ
 امتحان کے طور پر، جیسا کہ خود فرمایا وَ لَيَسْتَخْلِفَنَّكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرْ كَيْفَ تَعْمَلُونَ اور
 وہ تم کو زمین میں خلیفہ بنائے گا پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ اس وراثت میں دوام اور ہمیشگی
 نہیں ہے۔ یہ مستقل اور دائمی بندوبست نہیں ہے۔ یہ محض ایک امتحان کا موقع ہے جو خدا کے ایک
 ضابطے کے مطابق دنیا میں مختلف قوموں کو باری باری دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں اسی زمین
 کا دائمی بندوبست ہوگا، اور قرآن کے متعدد واضح ارشادات کی روشنی میں وہ اس قاعدے پر ہوگا کہ زمین
 اللہ کی ہے اور وہ اپنے بندوں میں سے صرف مومنین صالحین کو اس کا وارث بنائے گا، امتحان کے طور پر
 نہیں، بلکہ اُس نیک رویے کی ابدی جزا کے طور پر جو انہوں نے دنیا میں اختیار کیا۔

تلاہ دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ہم نے تم کو دنیا والوں کے لیے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے"
 دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دراصل نوع انسانی کے لیے خدا کی
 رحمت اور مہربانی ہے، کیونکہ آپ نے اگر غفلت میں پڑی ہوئی دنیا کو چوڑکا یا ہے، اور اُسے وہ علم
 دیا ہے جو حق اور باطل کا فرق واضح کرتا ہے، اور اس کو بالکل غیر مشتبہ طریقے سے بتا دیا ہے کہ اس کے
 نیچے تباہی کی راہ کونسی ہے اور سلامتی کی راہ کونسی۔ کفار بگڑھ ضرور کی بعثت کو اپنے لیے رحمت اور مصیبت

کہو "میرے پاس جو وہی آئی ہے وہ یہ ہے کہ تم ہمارا خدا صرف ایک ہے اور کیا تم میرا خدا سمجھتے ہو؟ اگر وہ منہ پھیرے تو کہہ دو کہ "میں نے علی الاعلان تم کو خیر دیا کر دیا ہے۔ اب یہ میں نہیں چاہتا کہ وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے قریب سے یا دور۔ اللہ وہ باتیں بھی جانتا ہے جو باور بلند کبھی بتاتی ہیں اور وہ بھی جو تم چھپا کر کرتے ہو۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاید یہ دو میں تمہارے لیے ایک فتنہ ہے اور تمہیں ایک وقت خاص تک کے لیے فرسے کرنے کا موقع دیا جا رہا ہے۔"

آخر کار رسول نے کہا کہ "اے میرے رب، حق کے ساتھ فیصلہ کر دے اور لوگوں کو تم جو باتیں بتاتے ہو ان کے مقابلے میں ہمارا رب رحمان ہی ہے۔ اے میرے لیے مدد کا سہارا ہے۔"

سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ اس شخص نے ہماری قوم میں پھوٹ ڈال دی ہے۔ نائنس سے گوشت جدا کر کے رکھ دیا ہے۔ اس پر فرمایا گیا کہ نادانو! تم جسے زحمت سمجھ رہے ہو یہ حقیقت میں تمہارے لیے خدائی رحمت ہے۔ اللہ اپنی خدا کی پکڑ جو دعوتِ رسالت کو رد کرنے کی صورت میں آئے گی۔ خواہ کسی نوعیت کے عذاب کی شکل میں آئے۔

۱۱۹ اشارہ ہے ان مخالفانہ باتوں اور سازشوں اور سرگوشیوں کی طرف جن کا آغاز سورہ میں ذکر کیا گیا تھا۔ وہاں بھی رسول کی زبان سے ان کا یہی جواب دیا گیا تھا جو باتیں تم بنا رہے ہو وہ سب خدا کے رہا ہے اور جانتا ہے۔ یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ یہ جو میں اور گئیں اور کبھی ان کی باز پرس نہ ہوگی۔

۱۲۰ یعنی تم اس تاخیر کی وجہ سے فتنے میں پڑ گئے ہو۔ تاخیر تو اس لیے کی جا رہی ہے کہ تمہیں سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دی جائے اور جلد بازی کر کے فوراً ہی نہ پکڑ لیا جائے۔ مگر تم اس سے اس غلط فہمی میں پڑ گئے ہو کہ نبی کی سب باتیں چھوٹی ہیں ورنہ اگر یہ سچا نبی ہوتا اور خدا ہی کی طرف سے آیا ہوتا تو اس کو جھٹلا دینے کے بعد ہم کبھی کے دھریے گئے ہوتے۔